سلسلہ مطبوعات: مشاہیرِ اُردو

ڈاکٹر نیّر مسعود

نیر مسعود

مقتدرہ قومی زبان ☆ پاکستان

۲۰۱۱ء

سلسلہ مطبوعات مقتدرہ: ۵۲۵

عالمی معیاری کتاب نمبر ISBN۹۷۸-۹۶۹-۴۷۴-۲۷۴-۸

☆

Acc No:- 11,698

طبع اوّل ۲۰۱۱ء

تعداد ۵۰۰

قیمت .... ۱۳۵/= روپے

فنی تدوین .... ڈاکٹر راشد حمید

ترتیب و صفحہ بندی .... منظور احمد

خطاطی .... ناصر سیماب، اظہر حسین

پروف خوانی .... حاجی غلام مہدی

طابع .... ایس ٹی پرنٹرز، راولپنڈی

اہتمام .... تجمل شاہ

ناشر .... **افتخار عارف**

صدر نشین

مقتدرہ قومی زبان، ایوانِ اُردو،

پطرس بخاری روڈ، ایچ۔۸/۴،

اسلام آباد، پاکستان۔

فون: ۰۵۱-۹۲۵۰۳۱۱-۱۳

فیکس: ۰۵۱-۹۲۵۰۳۱۰

پیش لفظ

مقتدرہ قومی زبان نے ادارے کے دوسرے اہم وظائف کے ساتھ ساتھ یہ ضرورت بھی محسوس کی کہ اُردو کے بنیاد گزاروں کو یاد رکھا جانا چاہیے تا کہ آئندہ نسلوں کو اُن کی علمی، ادبی اور لسانی خدمات سے آگاہ کیا جا سکے۔ مشاہیر اُردو کے عنوان سے پیش نظر سلسلۂ مطبوعات کا آغاز کیا گیا ہے جس میں اُردو کے محسنوں اور بنیاد گزاروں کی اُردو کے لیے خدمات پر تعارفی نوعیت کی مختصر مگر جامع کتابیں شائع کی جائیں گی۔ اس منصوبے کے تحت مختلف شخصیات پر تحقیقی اور تنقیدی اعتبار سے وقیع کتابیں مرحلہ وار اشاعت پذیر ہوں گی۔

میر ببر علی انیس رثائی شاعری کے امام ہیں اور اُردو کی رثائی شاعری ہی پہ کیا موقوف، تمام اُردو شاعری میں بہت نمایاں مقام پر فائز ہیں۔ یہ وہ شاعری ہے جو تاریخ، الہیات، فلسفے، منطق سمیت متعدد علوم سے بھی مملو ہے اور فنی و لسانی جمالیات کے حوالوں سے بھی آفاقی قدروں کی حامل ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ زبان جس کے دامن میں میر ببر علی انیس جیسا شاعر موجود ہے وہ یقیناً ایک بڑی اور توانا زبان ہونے کا دعویٰ بلا خوف و تردید کر سکتی ہے۔ مقتدرہ قومی زبان نے سلسلہ مطبوعات مشاہیر اُردو کے لیے میر ببر علی انیس کا انتخاب کیا تا کہ ان کی اُردو کے لیے خدمات کو خراج تحسین پیش کیا جا سکے اور نئی نسل بھی ان کی عظمت سے آگاہ ہو سکے۔

ڈاکٹر نیر مسعود اُردو کے نام ور محقق، ممتاز افسانہ نگار، صاحب نظر تنقید نگار ہیں اور اپنے لائق منزلت والد مرحوم پروفیسر مسعود حسین رضوی کی طرح انیسیات میں انھیں بھی امتیازی مقام حاصل ہے۔ انھوں نے ہماری درخواست پر میر ببر علی انیس کی شخصیت اور فن کے حوالے سے یہ کتاب لکھ کر اردو کی یقیناً بڑی خدمت سرانجام دی ہے جس کے لیے مقتدرہ قومی زبان کی جانب سے شکریے کے مستحق ہیں۔ ڈاکٹر نیر مسعود صاحب کی یہ کتاب میر انیس کی شخصیت اور خدمات کو صحیح تناظر میں سمجھنے میں معاون و مددگار ہوگی۔

—— افتخار عارف

ابتدائیہ

میر انیس کی یہ سوانح عمری میری کتاب ''انیس (سوانح)'' کا مختصر روپ ہے۔ اصل کتاب (پاکستانی ایڈیشن، آج' کراچی، ۲۰۰۵ء) خاصی ضخیم ہے۔ اس تلخیص کو عام قارئین کے لیے تیار کیا گیا ہے جو محض انیس کے حالات سے واقف ہونا چاہتے ہیں، اس لیے اس میں تحقیقی مباحث، حوالوں اور ماخذوں کی تفصیل وغیرہ حذف کر دیے گئے ہیں۔ مثلاً انیس کے سنہ ولادت کی بحث، لکھنؤ میں انیس کی مرثیہ خوانی کے آغاز، حیدر آباد کی مجلسوں واقعات وغیرہ کے ماخذوں پر گفتگو نہیں کی گئی ہے، ان ماخذوں سے جو نتائج نکلتے ہیں اور جو معلومات حاصل ہوتی ہیں، صرف ان سے سروکار رکھا گیا ہے۔ یہ بھی کوشش کی گئی ہے کہ اس تلخیص میں انیس کی زندگی کے تمام حالات محفوظ ہو جائیں۔

میرے عزیز دوست افتخار عارف، صدر نشین مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد کی خواہش تھی کہ انیس پر ایک اس قسم کی کتاب مقتدرہ کی طرف سے شائع ہو۔ امید ہے اس کتاب سے ان کی یہ خواہش پوری ہو جائے گی۔

نیر مسعود

فہرست

☆☆..........☆☆

پہلا باب

انیس: مرثیہ خواں

مولوی ذکاء اللہ انیس کی ایک مجلس میں اپنی شرکت کا حال یوں بیان کرتے ہیں:

''جب میں اس مجلس میں پہنچا تو تمام عالی شان مکان آدمیوں سے بھر چکا تھا بلکہ سیکڑوں مشتاق فرش کے کنارے زمین پر دھوپ میں کھڑے ہوئے محوِ سماعت تھے۔ میں بھی وہیں دھوپ میں کھڑا ہو کر سننے اور دور سے ٹکٹکی باندھ کر میر انیس کی صورت اور ان کے ادائے بیان کو دیکھنے لگا۔ میں میر انیس کے طرزِ بیان کی دل فریب اداؤں کی تصویر نہیں کھینچ سکتا۔ صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اس سے پہلے کسی کے ادائے بیان سے یہ مافوق الفطرت اثر پیدا ہوتے مشاہدہ نہیں کیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ منبر پر ایک کل کی بڑھیا بیٹھی ہوئی لڑکوں پر جادو کر رہی ہے جس کا دل جس طرف چاہے پھیر دیتی ہے اور جب چاہتی ہے ہنساتی ہے اور جب چاہتی ہے رلاتی ہے۔ میں اسی حالت میں دو گھنٹے کے قریب کھڑا رہا۔ میرے کپڑے پسینے سے تر اور پاؤں خون اترنے سے شل ہو گئے۔ لیکن میں جب تک میر انیس کی صورت دیکھتا اور ان کا مرثیہ سنتا رہا، مجھ کو یہ کوئی بات محسوس نہیں ہوئی۔''

(غالباً) صفیر بلگرامی کا بیان ہے:

''میں انیس کے کمال کا قائل نہ تھا۔ ایک دن اتفاقاً انیس کی ایک مجلس میں شرکت ہوئی اور میں بے دلی سے ان کو سننے لگا، لیکن دوسرے ہی بند کی

مندرجہ ذیل بیت:

ساتوں جہنم آتش فرقت میں جلتے ہیں
شعلے تری تلاش میں باہر نکلتے ہیں

انھوں نے اس انداز سے پڑھی کہ مجھے شعلے بھڑکتے ہوئے دکھائی دینے لگے اور میں ان کا پڑھنا سننے میں ایسا محو ہوا کہ اپنے تن من کا ہوش نہ رہا، یہاں تک کہ جب ایک دوسرے شخص نے مجھے ہوشیار کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ میں کہاں ہوں اور کس عالم میں ہوں۔''

شاہ عظیم آبادی انیس کو پہلی بار سننے سے کچھ دن پیشتر ان سے مل چکے تھے۔ انھیں انیس کے رویے میں سردمہری محسوس ہوئی تھی اور وہ ان سے کبیدہ خاطر تھے، اس لیے شروع کی مجلسوں میں ان کو سننے بھی نہیں گئے۔ چوتھی محرم کو داد کا شور سن کر وہ انیس کی مجلس میں پہنچے۔ بتاتے ہیں:

''اللہ اللہ! وہ لفظوں کا ٹھہراؤ، وہ لب ولہجہ، وہ سریلی دل کش آواز، وہ لبوں پر مسکراہٹ غرض کہ کس بات کو کہوں۔ اس وقت میر انیس کی جو بات تھی کلیجے کے اندر اتری جاتی تھی۔ وہ میر انیس ہی نہ تھے جن کو چند دن پہلے دیکھا تھا۔ چہرے سے لے کر صف آرائی، رخصت، لڑائی، شہادت، بین سب پورا پڑھا۔ آخر پسینے سے کُرتا بدن میں، ٹوپی سر پر بھیگ کر چپک گئی۔ ہاتھ تھام کر منبر سے اُتارے گئے۔ سیدھے فرودگاہ کی طرف بڑھے۔ میں بھی ننگے پاؤں، حیرت زدہ ساتھ ہولیا۔''

مجلسوں میں انیس کے سننے والوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان کا کلام سحر کا اثر پیدا کر رہا ہے یا اس کلام کے ادا کرنے کا انداز۔ انھیں ایک طرف انیس کی خوانندگی مدتوں یاد رہتی تھی، دوسری طرف وہ کلام جسے پڑھ کر وہ لوگ بھی وجد کرتے ہیں جنھوں نے اسے انیس کی زبان سے نہیں سنا۔

منبر پر پہنچ کر انیس میں کچھ شاہانہ انداز پیدا ہو جاتا اور ان کی نازک مزاجی بہت بڑھ جاتی تھی۔ احسن لکھتے ہیں:

> ''ان کے غصے کے وقت بڑے بڑے صاحب اقتدار لوگ آنکھیں نیچی کر لیتے تھے۔ ان کی ایک ڈانٹ نے دو شالہ اوڑھنے والوں کو پائین فرش جوتوں کے پاس بٹھا دیا ہے۔ ان کا نشۂ کمال ان کو عالمِ قدس کی اس بلندی پر پہنچا دیتا تھا جہاں سے اہلِ دوَل کی شان نہایت پست دکھائی دیتی تھی۔''

میر معصوم علی سوز خوان کا بیان ہے کہ ایک بار لکھنؤ کے ایک امیر کبیر انیس کی مجلس میں تشریف لائے۔ ان کے ساتھ ان کا آب دار خانہ وغیرہ آنا شروع ہوا۔ اس میں دیر ہوئی۔ انیس منبر پر خاموش لیکن غصے میں بھرے بیٹھے رہے۔ اس اثنا میں حاضرین میں سے کسی نے کہا میر صاحب بسم اللہ آپ مرثیہ شروع فرمائیں۔ انیس بولے، کیا شروع کروں، آپ کا جہیز تو آئے۔

انیس کی یہ نازک مزاجیاں زیادہ تر امیروں کے طبقے کے ساتھ تھیں۔ عام سامعین کے ساتھ کبھی کبھی وہ رعایت بھی کر جاتے تھے۔ بجنور کے ایک بزرگ خورشید حسین کا بیان ہے کہ ایک بار میں میر انیس کی مجلس میں شریک ہوا۔ مجمع بہت تھا۔ میں چاہتا تھا کہ منبر کے کچھ قریب پہنچ جاؤں مگر مجمع راہ نہ دیتا تھا۔ میں انھیں قریب سے سننے کے لیے اتنا بے چین تھا کہ پکار کر میر صاحب سے کہا کہ حضور میں دور سے آپ کو سننے آیا ہوں۔ یہ لکھنؤ والے تو روز آپ کو سنا کرتے ہیں۔ لیکن مجھ کو جگہ نہیں دیتے کہ آپ سے کچھ قریب ہو جاؤں۔ یہ سن کر میر صاحب نے مرثیہ روک لیا اور کہا آیئے، تشریف لایئے جب تک میں منبر کے قریب نہیں پہنچ گیا انھوں نے پڑھنا شروع نہ کیا۔

انیس کو منبر پر پڑھتے سننا ایسا تجربہ ہوتا تھا کہ لوگوں کے ذہن میں زندگی بھر تازہ رہتا تھا۔ وہ آئندہ کبھی اس کا ذکر کرتے تو یہ اعتراف بھی کرتے تھے کہ اس وقت کی کیفیت زبان یا قلم سے بیان نہیں ہو سکتی۔ ایک بزرگ علی مرزا نے احسن کو بتایا کہ جب کوئی بند پڑھتے ہیں اس پر خود بھی رقت طاری ہونے لگتی تھی تو وہ گریہ ضبط کرنے کے لیے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیتے اور ان کا داہنا رخسار

پھڑ کنے لگتا تھا۔ ان کی یہ ادا اہل مجلس کو رقت سے بے تاب کر دیتی تھی۔ احسن بتاتے ہیں کہ علی مرزا:

''یہ نقل میرے سامنے بیان کرتے اور روتے جاتے تھے۔ فرماتے تھے واللہ، اس وقت آنکھوں کے وہ تصویر پھر رہی ہے۔ میں نے کہا کچھ اور حالات میر صاحب کے آپ کو معلوم ہوں تو فرمائیے۔ جواب دیا کہ کیا بتاؤں اور کیا سناؤں۔ دل نے جو کچھ ان کی صحبت اور شاعری کے مزے لیے ہیں، زبان ان کو بیان کرنے سے قاصر ہے۔ پھر خاموش ہو رہے۔''

انیس کی مرثیہ خوانی کے بارے میں شیخ حسن رضا کا کہنا ہے کہ وہ ''نشست سے بالائے منبر قدرتِ خدا کے جلوے کی تصویر کھینچتے تھے۔''

محمد حسین آزاد نے انیس کی آواز اور پوری ہیئت کو مرثیہ خوانی کے فن کے لیے ''ٹھیک اور موزوں'' بتایا ہے اور نواب مرزا دلاور حسین کا کہنا تھا:

''مرثیہ پڑھنے کا کیا ذکر، انیس کی طرح منبر پر بیٹھنا کسی کو نہیں آیا۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ منبر کے اوپر تشریف فرما نہیں ہیں بلکہ منبر ہی سے اگ کر باہر نمودار ہو گئے ہیں۔''

انیس کی مرثیہ خوانی میں ان کا کلام، ان کا لب ولہجہ، آواز، چہرے کے تاثرات، اشارات، یہاں تک کہ منبر اور مکانِ مجلس بھی ان کی ظاہری ہیئت میں مل کر ایک ہو جاتے تھے۔ جب تک وہ مرثیہ پڑھتے رہتے، سننے والے خود کو کسی دوسری دنیا میں پاتے اور انیس انھیں کوئی ورائے فطرت وجود یا کم سے کم ایک عجوبہ معلوم ہوتے۔ یہ انیس کی فنی شخصیت تھی جو قریب نصف صدی تک لوگوں کو منبر پر نظر آتی رہی اور اکثریت انیس کی اسی شخصیت سے آشنا تھی۔ لیکن لوگوں کو یہ تمنا ضرور رہتی تھی، جس طرح آج ہم کو رہتی ہے، کہ اس منبری شخصیت کے ساتھ ہم اس کی دوسری سماجی اور گھریلو شخصیت سے بھی آشنا ہو جائیں۔

۲۔ انیس: شخص

انیس کی تصویر میں ان کی غلافی آنکھیں، آنکھوں کے نیچے باریک جھریاں، رخساروں کی ہڈیوں کا ہلکا سا ابھار، ذرا پھیلے ہوئے نتھنے اور بھنچے ہوئے پتلے پتلے ہونٹ مل کر ایک ایسے شخص کا تاثر پیدا کرتے ہیں جو بہت ذکی الحس اور ارادے کا مضبوط ہے، دنیا کو ٹھکرا دینے کا نہ صرف حوصلہ رکھتا ہے بلکہ شاید ٹھکرا بھی چکا ہے۔ وہ کسی کو اپنے ساتھ زیادہ بے تکلف ہونے کی اجازت نہیں دے سکتا ہے، نہ کسی سے مرعوب ہو سکتا ہے اور اس کی خاموش اور بہ ظاہر پرسکون شخصیت کی تہہ میں تجربات اور تاثرات کا ایک طوفان برپا ہے۔

یہ تصویر (جو میر علی عارف کے خاندان میں موجود ہے) انیس کا صرف ناک نقشہ اور جزئی طور پر لباس دکھاتی ہے۔ کچھ اور بیان ان کا پورا حلیہ دکھاتے ہیں، مثلاً قد میانہ مائل بہ درازی، ورزش کی وجہ سے جسم ٹھوس، اعضا مناسب و چست، چھریرا بدن، چوڑا سینہ، صراحی دار گردن، خوبصورت کتابی چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں، گیہواں رنگ، مونچھیں ذرا بڑی، داڑھی اتنی باریک کترواتے تھے کہ دور سے دیکھنے پر منڈی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ چہرے کی رنگت میں رات رات بھر جاگنے کی وجہ سے زردی آ گئی تھی۔

بالعموم گھٹنوں سے نیچا خوب گھیر دار کرتا پہنتے تھے جو سفید جامدانی، تن زیب یا ململ کا ہوتا تھا۔ کرتے کی آستینیں بہت باریک چنی جاتی تھیں جن کے لچھے بن کر خود بہ خود کہنیوں تک چڑھ جاتے تھے۔ جاڑوں میں روئی دار دگلا بھی پہن لیتے تھے جو گٹوں تک پہنچتا تھا۔ پائجامہ سفید، سبز، اودا یا گلابی مشروح یا گل بدن کا ہوتا تھا اور تقریباً دو میٹر میں مع نیفے اور مغزی کے بنتا تھا۔ سر پر پنج گوشیہ ٹوپی جس کے ہر گوشے پر صراحی یا کنٹھا کڑھا ہوتا تھا، گرمیوں میں سفید اور جاڑوں میں ریشمی کام کی رنگین ہوتی تھی۔ ہاتھ میں رومال اور ہروتی کی جریب۔ ان کے پاس مرشد آبادی ہروتی کی جریبیں تھیں جنھیں ٹین کے چونگوں میں تیل بھر کر ان میں ڈبویا جاتا تھا اور رات کو نکال کر

اوس میں رکھا جاتا تھا تا کہ ان میں عنابی رنگ پیدا ہو۔ جریبوں میں چاندی کی شام ہوتی تھی اور بعض پر سونے چاندی کے تار بندھے ہوتے تھے۔ انگلیوں میں دو تین انگوٹھیاں۔

ٹوپیاں گولوں پر چڑھا کر رکھی جاتی تھیں اور باہر جاتے وقت کئی کئی ٹوپیوں سے انتخاب کر کے کوئی ایک پہنتے اور اس کو سر پر ٹھیک سے جمانے میں خاصا وقت صرف کرتے تھے۔

کاندھے پر کبھی کبھی دوپٹا آڑا کر کے ڈال لیتے، یا للکلاٹ کا رومال ڈالتے تھے۔ جاڑوں میں عمدہ فرد کی رضائی بھی اوڑھا کرتے جس کا آنچل ایک خاص انداز سے کاندھے پر ڈالتے تھے، دوسرے لوگ اس انداز کو نقل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

پاؤں میں زرد مخمل کا سادہ گھتیلا جوتا گھر میں اور باہر پچیس تیس روپے والا کارچوبی کا جو اکثر لکھنؤ کے مشہور کاریگر ببر علی کو گھر پر بلوا کر تیار کرایا جاتا تھا۔

انیس کو قدرت کی طرف سے غیر معمولی آواز ملی تھی جو مدھم یا بلند ہونے پر بلکہ پکار کی صورت میں بھی یکساں دل کش رہتی تھی اور اس کے جوہر مرثیہ خوانی کے وقت منبر پر پوری طرح کھل کر سامنے آتے تھے۔ انیس کے ایک شاگرد کے بیٹے سید محمد جعفر نے ادیب کو بتایا کہ:

> ''میر انیس کی آواز میں جو دل کشی تھی وہ کسی انسان کا کیا ذکر، کسی خوش الحان پرند اور کسی باجے کی آواز میں بھی نہیں ہے۔''

زیادہ تر لوگ ان کی ''سریلی اور میٹھی'' آواز کا بہ طور خاص ذکر کرتے ہیں۔ سید محمد جعفر نے یہ بھی بتایا کہ:

> ''جب کبھی وہ بے تکلف احباب کی صحبت میں کمرے کے اندر دروازے بند کر کے میر حسن کی مثنوی بلند آواز سے پڑھتے تھے تو راہ گیر کھڑے ہو کر دیر دیر تک سنا کرتے تھے۔''

....

خوش آوازی کے ساتھ انیس کی خوش گفتاری کے بھی کئی بیان ملتے ہیں، لیکن ان کی کم سخنی

کا بھی ذکر ہوا ہے۔ آزاد نے لوگوں سے بھی سنا اور خود بھی ان سے مل کر یہی تاثر قائم کیا کہ وہ ''کم سخن تھے''، کہ ''خاموش تھے''، اور شاد بھی یہی بتاتے ہیں کہ انیس ''اکثر خاموش رہتے تھے۔''

انیس نے خود بھی اپنی خاموشی کی طرف اشارے کیے ہیں، مثلاً ''اک مُہرِ گویا لب خاموش پہ ہے'' اور سمجھے جو زبانِ بے زبانی تو کہوں...... جو مجھ کو مزہ ملا ہے خاموشی ہے۔''

....

کم بولنے اور بلاضرورت نہ بولنے کی وجہ سے بعض لوگوں کو انیس کے مزاج میں روکھے پن کا شبہ ہوا تھا، لیکن جب وہ بولتے تو ان کی گفتگو بھی ان کی خوانندگی کی طرح سننے والوں کی پوری توجہ اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔ اسی لیے ہم کو انیس کی کم گفتاری سے زیادہ خوش گفتاری کے بیان ملتے ہیں۔ میر حامد علی بتاتے ہیں:

''میر انیس نہایت خوش گفتار تھے۔ جب کسی صحبت میں وہ گفتگو کرنے لگتے تھے تو کوئی شخص کسی دوسری طرف متوجہ نہیں ہو سکتا تھا۔''

آزاد انیس کی کم سخنی کے ذکر کے ساتھ یہ بھی بتاتے ہیں کہ وہ ''جب بولتے'' تو وہ فقرہ کہ موتی کی طرح ٹانکنے کے قابل'' اور ''ان کا ایک ایک لفظ کانٹے کی تول ہوتا تھا۔''

شریف العلما نے بھی انیس سے گفتگوؤں کے بعد اپنے بھائی کو لکھا:

''میر انیس نہایت خوش تقریر ہیں کہ آدمی محو ہو جاتا ہے۔ اگر کچھ بات کرنے لگتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سے بہتر کوئی بات ہی نہیں ہے۔''

امجد علی اشہری لکھتے ہیں:

''ان کی معمولی باتوں میں ادائے کلام سے اعجاز فصاحت کا اثر ظاہر ہوتا تھا اور وہ معجز بیانی ان کا حصہ تھی جو دوسری جگہ نہ مل سکتی تھی اور ان پر ختم ہو گئی جس کو ان کے دیکھنے والے آج بھی یاد کرتے اور نہ دیکھنے والوں کو محوِ حیرت بناتے ہیں۔''

انیس کی گفتگوئیں کئی لوگوں نے نقل کی ہیں جن سے یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ انھوں نے کیا کہا، لیکن یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کن لفظوں میں کہا۔ البتہ ان کے بولے ہوئے چند ایسے فقرے ہم تک پہنچے ہیں جن کے بارے میں تقریباً یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ انیس کی زبان سے نکلے تھے اور اپنی بے ساختگی اور اختصار کی وجہ سے راویوں کو لفظ بہ لفظ یاد ہو گئے تھے۔ وہ فقرے یہ ہیں:

١۔ ''آپ کا جہیز تو آئے۔''

٢۔ ''ابے، تو مرثیہ پڑھے گا؟''

٣۔ ''بھیا، اب کما کھاؤ گے۔''

٤۔ ''پیارے، ہماری غزل سنو۔''

٥۔ ''جمادات و نباتات کے سامنے کیا پڑھوں؟۔''

٦۔ ''خیر، دیکھا جائے گا۔''

٧۔ ''سر درد کر رہا ہے۔''

٨۔ ''شریف حسین! آخر تو باز نہ آیا۔''

٩۔ ''صاحبو! جا گہ ادھر ہے۔''

١٠۔ ''عجب خالی الذہن شخص ہے۔''

١١۔ ''ہائے لکھنؤ! تجھے کہاں سے لاؤں۔''

١٢۔ ''یہ داغ سخت لگا۔''

گفتگو میں انیس کبھی کبھی اپنے لیے واحد غائب کا صیغہ استعمال کرتے تھے مثلاً

١۔ ''جن صاحبوں کو انیس کو سننا ہو وہ تشریف لائیں۔''

٢۔ ''اس معاملے میں انیس مجبور ہے۔''

٣۔ ''انیس کی جوتی کے چالیس ستارے جھڑ گئے۔''

٤۔ ''انیس برخلافِ وضع نہیں کر سکتا۔''

۵۔ ''انیس اس سے زیادہ کیا کرے گا۔''

انیس کی خوش گفتاری ان کی خوش صحبتی کی ضامن تھی۔ ہمیں ان کی صحبتوں کی پرکیفی کے بیان بھی ملتے ہیں اور ان صحبتوں میں انیس کی گفتگوؤں کے بھی۔ اشہری بتاتے ہیں:

''میر صاحب کے پاس اکثر اعلیٰ درجے کے علما، ادبا اور مستند با کمال تشریف لاتے تھے اور میر صاحب ہر ایک سے ان کے درجہ و مقام کے موافق گفتگو فرماتے تھے۔''

انیس کی پاس دلچسپ واقعات، مختلف النوع معلومات، اردو، فارسی، بھاشا کے کلام کا نہ ختم ہونے والا ذخیرہ تھا جو ان کی خوش گفتاری کے ساتھ مل کر ان کی صحبتوں کو یادگار بنا دیتا تھا۔ شاد نے ان سے ملاقاتوں کے بعد یہ تاثر قائم کیا:

''میر انیس ہرگز بدمزاج، خود پسند، بداخلاق نہ تھے۔ میں بھی پہلے یہی خیال رکھتا تھا، مگر جب ملا اور صحبتیں ہوئیں تو معلوم ہوا کہ ان سے زیادہ خوش مزاج، منکسر، خوش اخلاق شاید ہی کوئی ہو۔ خندہ روئی کے ساتھ لوگوں سے جھک کر صاحب سلامت اور تعظیم کرنا، ہاتھ جوڑ جوڑ کر جناب اور آپ اور حضور کے کلمے سے مخاطب کرنا، اہل فن کی حرمت کرنا، بزرگوں کے نام کو تعظیم سے لینا، سرِ مُوس میں فرق نہ آتا تھا۔''

ان صحبتوں میں شعر و شاعری کا خاص طور پر تذکرہ ہوتا تھا۔ اچھے اچھے شعر پڑھے جاتے اور ان پر تبصرہ کیا جاتا۔ انیس دوسرے شاعروں کا کلام زیادہ سناتے تھے، اپنے شعر شاذ ہی پڑھتے تھے۔ انھیں شاہنامہ فردوسی کے اشعار بہت یاد تھے اور وہ فردوسی کو خدائے سخن کہتے تھے۔ مختلف موقعوں پر انیس نے جو شعر پڑھے ان میں سے چند حسب ذیل ہیں:

تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو
رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے

تیری گلی میں ہم نہ چلیں اور صبا چلے
یوں ہی خدا جو چاہے تو بندے کا کیا چلے

سانولے رنگ سے بھا گو حسن کیا اس میں تمھارا جاتا ہے
ایسے دھند لکے بیچ مسافر مفت میں مارا جاتا ہے

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
کہ میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

نہ کچھ شوخی چلی باد صبا کی
بگڑنے میں بھی زلف اس کی بنا کی

انیس کے شعری ذوق اور سخن فہمی کا تقاضا تھا کہ عمدہ شعران کو متاثر کریں۔ ان کے حالات میں اس کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ ایک بار ان کے ایک ملاقاتی نے ان کے سامنے یہ شعر پڑھا:

روشن ہے اس طرح دل ویراں میں داغ ایک
اجڑے نگر میں جیسے جلے ہے چراغ ایک

انیس لیٹے ہوئے تھے۔ ایک اُف کر کے بیٹھ گئے اور کہا میں اب بڑھاپے میں ایسے شعروں کی تاب نہیں لا سکتا۔ اس سن میں ایسے تیر نہیں کھا سکتا۔

اپنی صحبتوں میں شاعروں اور شعروں پر تبصرے بھی کرتے تھے۔ اسی شعر ''روشن ہے اس طرح......'' کے ذکر میں یہ بیان بھی ملتا ہے:

''اس کے بعد حسب معمول اس شعر پر تبصرہ ہونے لگا۔ میر صاحب نے اس کی شرح کے سلسلے میں فرمایا کہ پرانے زمانے میں جب کسی بستی پر عتاب شاہی نازل ہوتا تھا تو وہ بستی ویران کر دی جاتی تھی اور اس میں

کسی نمایاں مقام پر ایک چراغ جلا دیا جاتا تھا۔"

انیس کی گفتاری، ان کے بیان کیے ہوئے واقعے اور شعر و شاعری کے تذکرے ان کی محفلوں میں جان ڈال کر ان کی صحبتوں کو مزید دلچسپ بناتے تھے۔ ان کی شخصیت کا ایک اور پہلو ان محفلوں میں اور بھی جان ڈال دیتا تھا۔ یہ ان کی حسِ مزاح تھی۔

اپنے رثائی کلام میں انیس غم کے زبردست عکاس اور المیہ نگاری کے ماہر کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ اعلیٰ المیہ نگاری اعلیٰ درجے کی حسِ مزاح کا مطالبہ کرتی ہے اور یہ حسِ مزاح ان کی شخصیت میں اس قدر نمایاں تھی کہ ان کے تینوں سوانح نگاروں، اشہری، احسن اور شاد نے بالالتزام ان کے لطیفوں اور بذلہ سنجیوں کے نمونے دیے ہیں۔ آزاد نے انیس کی شخصیت اور حالات زندگی کے بارے میں بہت کم لکھا ہے لیکن انھوں نے بھی ان کا بیان کیا ہوا ایک لطیفہ درج کرنا ضروری سمجھا۔ کچھ لطیفے حسب ذیل ہیں:

انیس بیمار تھے۔ مفتی میر عباس عیادت کو آئے اور ان کی نبض دیکھ کر بولے، اب تو بخار خفیف ہو گیا۔ انیس نے کہا کہ ایک مشتِ استخواں کی ناتوانی دیکھ کر ایسا خفیف ہوا ہے کہ شاید اب کم بخت منھ نہ دکھائے گا۔

انیس نے اپنی خریدی ہوئی زمین کے سب درخت کٹوا دیے۔ صرف نیم کا ایک درخت باقی تھا کسی صاحب نے ان سے پوچھا کہ سب زمین صاف ہو گئی؟ انیس نے جواب دیا، آدھی رہ گئی ہے۔ وہ صاحب زمین دیکھ کر آئے اور کہنے لگے، سب تو صاف ہو گئی ہے۔ انیس بولے، لطیفے کی بھی مٹی خراب کی۔ صاحب "نیم" تو باقی ہے۔

اصلی حسِ مزاح کی خاصیت ہے کہ یہ غصے کے موقعے پر بھی جاگ اٹھتی ہے۔ انیس کی بذلہ سنجی بھی ایسے موقعوں پر ابھر آتی تھی، مثلاً:

"ایک نواب صاحب انیس کی خدمت میں مرثیے کی مشق فرما رہے تھے۔
اتفاق سے کھجانے کی ضرورت محسوس ہوئی، ضبط نہ کر سکے۔ دامن ہٹا کر

پیٹ کھجانے لگے۔ میر صاحب نے کنکھیوں سے دیکھا اور خاموش ہور ہے۔ مگر نواب صاحب کا کھجانے کا سلسلہ دیر تک جاری رہا۔ اب تو میر صاحب کا چہرہ سرخ ہو گیا اور فرمایا ''رکھ دو مرثیہ اور پہلے اچھی طرح کھجالو۔'' نواب صاحب نے معافی چاہی۔ میر صاحب نے فرمایا نہیں صاحب کھجایئے اور اچھی طرح کھجایئے۔ آپ نے مرثیے کی تعلیم دُھر پد اور ٹپے کی تعلیم سمجھی ہے کہ گائے بھی جاتے ہیں اور کھجاتے بھی جاتے ہیں۔''

انیس کی حسِ مزاح کبھی کبھی علمی مذاق کی صورت میں بھی نمود کرتی تھی جس کا ایک واقعہ درج ذیل ہے۔ یہ مذاق بھی بہت غصے کے عالم میں کیا گیا تھا:

''داروغہ اچھے صاحب فخر انیس کے شاگرد تھے اور اکثر ان کے یہاں حاضری دیا کرتے تھے۔ ایک بار مجلس میں انیس کے سامنے انھوں نے انیس کا مرثیہ پڑھا اور اپنے نزدیک خوانندگی کے خوب خوب جوہر دکھائے۔ اس دن احسن کے والد جب انیس کے یہاں پہنچے تو انیس نے پوچھا، آپ نے داروغہ صاحب کا پڑھنا دیکھا؟ انھوں نے داروغہ صاحب کی تعریف کی تو انیس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا، بولے، ''بھئی تم ایسا کہتے ہو؟ میرے مرثیے کی ہڈیاں پسلیاں توڑ دیں۔ میرے مضامین پر ظلم کیا۔ میرے دل پر جو صدمہ گزرا ہے میں ہی جانتا ہوں''۔ اتنے میں داروغہ صاحب بھی آ پہنچے۔ انیس نے کہا ''دیکھیے یہاں بھی مجھ سے داد لینے آئے ہیں۔'' داروغہ صاحب آ کر بیٹھے ہی تھے کہ انیس نے کہا ''اچھے صاحب، آج کی مجلس یادگار پڑھے ہو۔ میں حیران ہوں کہ میرے خیالات شاعری کے لیے تم میں جذبات خوانندگی کہاں سے پیدا ہو جاتے ہیں۔'' داروغہ صاحب کھڑے ہو کر تسلیمات بجالائے اور

بیٹھ گئے۔ انیس نے پھر تعریف کا سلسلہ شروع کر دیا۔ داروغہ صاحب نے
پھر کھڑے ہو کر تسلیم کی۔ اس طرح پانچ چھے مرتبہ انیس نے ان کو اٹھا بیٹھی
کرائی۔ پھر نفیس کو بلوایا اور ان سے بولے ''کہو بھئی خورشید علی، تم نے
اچھے صاحب کا پڑھنا سنا؟'' نفیس نے بھی تعریف کی۔ انیس نے کہا''
خدا جانے آج تک اس مرثیے کو میں کیا پڑھا اور تم کیا پڑھے۔ مرثیے کے
جوہر تو آج اچھے صاحب کے پڑھنے سے کھلے ہیں۔'' داروغہ صاحب
خوش ہو گئے اور کھڑے ہو کر مزید تسلیمیں بجالائے۔''

انیس کی صحبت کی انھی دلچسپیوں کا اثر تھا کہ ان کی عمومی کم آمیزی اور نازک مزاجی کے باوجود لوگ کھنچ کھنچ کر ان کے پاس آتے تھے۔ لیکن ان سے ملاقات کرنا آسان نہ تھا۔ لکھنؤ کے دربار دار امیروں کے سوا کم لوگوں سے ملنا اتنا مشکل ہوگا جتنا انیس سے ملنا۔ اشہری لکھتے ہیں:

''میں نے جناب حامد علی خان بیرسٹر اور نواب بدھن صاحب جیسے اکابر
لکھنؤ سے سنا ہے کہ میر صاحب تک پہنچنے اور ان سے ہم کلام ہونے کے
لیے درباری قسم کے چند قواعد کی پابندی لازم تھی۔ کوئی یوں بے تکلف
سامنے نہ جا سکتا تھا۔ جب تک میر صاحب اس کے آنے کی اجازت نہ
دیں یا ملاقات کا وقت مقرر نہ ہو جائے۔ روزمرہ کے آنے جانے والے
بھی ایک اطلاع کے بعد باریاب ہوتے تھے۔''

فارغ سیتاپوری بتاتے ہیں:

''میر صاحب کا یہ قاعدہ تھا کہ بے وقت جو شخص ان کے مکان پر جاتا تھا
اس سے ملاقات نہیں کرتے تھے'' اور یہ کہ'' جناب مرحوم نے میرے
واسطے ایک خاص وقت مقرر کیا۔''

معمولات

انیس صبح کو نو بجے کے قریب سو کر اٹھتے تھے۔ اٹھنے کے کوئی ایک گھنٹے بعد کھانا کھا لیتے تھے۔ کھانے سے فراغت کے بعد مونس، نفیس اور دوسرے شاگردوں کو کلام پر اصلاح دیتے تھے۔ دو بجے کے قریب پھر سو جاتے تھے۔ سہ پہر کو بیدار ہو کر نماز عصر پڑھتے، غسل کرتے، کبوتروں کو دانہ وغیرہ دیتے۔ اس وقت ان کا مزاج عموماً شگفتہ رہتا تھا۔ اہلیہ اور دوسرے گھر والوں سے خانگی امور کے بارے میں زیادہ تر اسی وقت گفتگو ہوتی تھی۔

تیسرے پہر سے ملاقاتیوں کا سلسلہ شروع ہوتا۔ بیچ میں نمازِ مغرب، کبھی گھر پر، کبھی مسجد میں باجماعت پڑھتے۔ ملاقاتیں دیر رات تک جاری رہتی تھیں۔ ان سے فرصت پا کر زنانے مکان میں آتے اور نمازِ عشا پڑھ کر کھانا کھاتے تھے۔ اس کے بعد پان کھا کر کچھ دیر ٹہلتے، پھر اپنے لکھنے پڑھنے کے کمرے میں چلے جاتے اور وہیں مرثیہ گوئی اور مطالعہ میں رات گزارتے تھے۔ اس وقت زیادہ تر دو زانو بیٹھتے، دونوں ہاتھ رخساروں پر رکھے رہتے۔ لکھتے وقت بھی بایاں ہاتھ رخسار پر ہوتا تھا۔ سامنے کنول میں لگی ہوئی تیز روشنی کی بڑی شمع ہوتی۔ کہا کرتے تھے وہ شاعر ہی کیا جو تین شمعیں روزانہ جلا کر مشقِ سخن نہ کرے۔ داہنے بائیں کتابیں رہتی تھیں۔ رات کو اپنے پاس پانی کی جھجھری، آب خورہ اور ایک روغنی روٹی رکھوا لیتے تھے۔ مرثیہ کہتے وقت مکان کے جنوبی رخ کے دوسرے درجے میں تخت پر بیٹھتے تھے۔ جب کچھ سوچنے لگتے تو اکثر کہنیاں زانو پر ہوتی تھیں۔

کھانا بہت سادہ اور مقدار میں کم کھاتے تھے۔ پھلکے اور قورمہ یا قلیہ عام طور پر ان کی غذا تھی۔ ان کے پینے کا پانی پتھر کے ایک کاسہ نما برتن میں بھرا جاتا تھا اور اس میں تپتے ہوئے لوہے کا ٹکڑا ڈال دیا جاتا تھا۔ یہ برتن ''آہن تاب'' کہلاتا تھا۔ اس کے پیندے میں ایک سوراخ تھا جس سے ٹپکتا ہوا پانی نیچے لگے ہوئے برتن میں جمع کر لیا جاتا۔ انیس یہی پانی پیتے تھے۔ اس ''آبِ آہن تافتہ'' کے بہت سے طبی فوائد تھے۔

آم اُن کا پسندیدہ پھل تھا۔ لنگڑا آم، خصوصاً بنارس کا لنگڑا، بہت شوق سے کھاتے تھے۔ ایک بار حکیم سید علی نے انھیں آموں کا ٹوکرا بھیجا تو انیس نے ''ابۂ شیریں ادا'' اور ''میوۂ مراد'' کی رسید میں انھیں لکھا کہ اس نعمت کا شکریہ کس طرح ادا کروں کہ شیرینی کی وجہ سے ہونٹ سے ہونٹ الگ ہی نہیں ہو رہے ہیں۔ اس کو نبات وقندِ شیرین کا کوزہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ ''سخت ادا'' یہ نزاکت اور لطافت کہاں سے لائے۔ جس کے بھی ہونٹ اس کے نازک دہن تک پہنچ گئے وہ شیریں لبوں کے بوسے سے بے نیاز ہو گیا۔

دلچسپیاں اور مشاغل

انیس کو عمدہ کتابیں رکھنے اور پڑھنے کا شوق تھا۔ ورزش اور سپہ گری سے بھی ان کو دلچسپی تھی۔ پتنگ اڑاتے تھے مگر پیچ نہیں لڑاتے تھے۔ کبوتر شوق سے پالتے تھے۔ موسیقی سے بھی دلچسپی تھی۔ تنہائی میں سوز خوب پڑھتے تھے۔ دھن بھی بنا لیتے تھے۔ شام کو اکثر تفریحی غسل کرتے تھے جس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ مردانہ مکان کے آنگن میں تازے پانی کے بہت سے گگرے بھرے رکھے ہوتے تھے اور انیس لنگی باندھے ہوئے ٹہل ٹہل کر نہاتے تھے۔ انھیں چھڑیوں کا بہت شوق تھا۔ لوگ ان کے لیے مرشدآباد کی ہروتیاں تحفے کے طور پر لاتے تھے۔ ان کے پاس پچاس ساٹھ ہروتی کی جریبیں تھیں۔ حُقہ پینے کا اس زمانے میں عام رواج تھا، انیس بھی پیتے تھے لیکن ان کے لیے فیض آباد سے کڑوا تمبا کو آتا تھا۔ لکھنؤ کا نفیس ہلکا تمبا کو انھیں پسند نہیں تھا۔

مذہبیت

انیس مذہبی فرائض، روزہ نماز وغیرہ کے بہت پابند تھے۔ رمضان میں کئی بار افطار کی دعوت کرتے تھے۔ ولایتی انار کے دانے شیشے کی نفیس طشتریوں میں پیش کیے جاتے اور برف کی قلفیوں سے افطار ہوتا تھا۔ اس کے ایک گھنٹے بعد کھانے میں مرغ پلاؤ، شیرمال، کباب، کئی طرح کے سالن اور عمدہ سفید میٹھے چاول ہوتے تھے۔ انیس بہت انکسار کے ساتھ سب کی خاطر کرتے

تھے۔ کھانے کے بعد پھولوں کے ہار، ورق لگی گلوریاں اور عطر کی شیشیاں پیش ہوتی تھیں۔ مجلس ماتم، نذر نیاز، منت، مراد وغیرہ کا ان کی زندگی میں بہت دخل تھا۔

مخفی علوم

فارغ سیتاپوری بتاتے ہیں کہ ان کو انیس نے کچھ باتیں تعلیم کی تھیں جو کشف و کرامت سے تعلق رکھتی تھیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ راجا کاظم حسین کے کسی مقدمے کا فیصلہ انیس نے پیشگی لکھ کر دے دیا تھا۔ جب عدالتی فیصلہ سنایا گیا تو وہ انیس کی تحریر کا ترجمہ تھا۔ اس کے علاوہ انیس کے مرثیوں کے کئی مخطوطوں پر طرح طرح کے اعداد لکھے ہوئے ملتے ہیں جن کا تعلق علم جعفر یا علم الاعداد سے ہو سکتا ہے۔

گھر میں

انیس کے ذمے ایک بڑے کنبے کی کفالت تھی۔ ان کے متوسلوں میں بیوی، تین بیٹیوں، ایک بھائی (مونس) اور کئی ملازموں کا ہمیں علم ہے۔ وہ اپنے داماد صابر کی بھی کچھ کفالت کرتے تھے۔ ان کے نواسے سید علی مانوس بھی اپنی والدہ کی وفات کے بعد انیس کے ساتھ رہے۔ پرانے خاندانوں میں گھر کے اصل افراد کے علاوہ دور کے نادار رشتہ داروں (خصوصاً سن رسیدہ عورتوں) کو بھی کنبے کا سربراہ اپنے یہاں رکھتا اور ان کا خرچ اٹھاتا تھا۔ مونس اور نفیس خود کفیل ہونے کے بعد سے علیحدہ مکانوں میں رہنے لگے تھے لیکن منجھلے بیٹے میر عباس رئیس اور چھوٹے میر محمد سلیس اپنے عیال کے ساتھ انیس ہی کے زیر کفالت رہے۔

اس زمانے کے مکانوں میں زنانے اور مردانے درجے الگ الگ ہوتے تھے اور صاحب خانہ کے وقت کا زیادہ حصہ مردانے درجے میں گزرتا تھا۔ انیس کے بھی معمولات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زیادہ وقت مردانے میں گزارتے تھے، البتہ مقررہ اوقات میں مثلاً سونے اور کھانے کے وقت زنانے میں آ جاتے تھے۔

انیس کا رعب پورے گھر پر چھایا رہتا تھا اور یہ رعب اس وقت بھی قائم تھا جب وہ چلنے پھرنے سے معذور بسترِ مرگ پر پڑے رہتے تھے۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ گھر کے شفیق اور محبت کرنے والے بزرگ بھی تھے۔

ملازمین

پرانے کنبوں میں ملازموں کی تعداد گھر والوں کی تعداد کے آس پاس ہوا کرتی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہ ملازم فراموش ہو جاتے ہیں بلکہ ان کے نام بھی محفوظ نہیں رہتے۔ چنانچہ ہم کو اپنے ادبی مشاہیر کے ملازمین کا بہت کم علم ہے۔ انیس کے معاملے میں یہ ایک غیر معمولی بات ہے کہ ان کے حسب ذیل نو ملازموں کا سراغ ملتا ہے:

۱۔ میر اکبر علی

۲۔ بدوی بیگم

۳۔ خدا بخش

۴۔ میر راحت علی

۵۔ سید علی حسین

۶۔ غلام عباس

۷۔ کسیا مالی

۸۔ شیخ نجف علی

۹۔ حاجی نور محمد

فوق فطری روایتیں

پرانے خاندانوں میں تقریباً بلا استثنا ہر خاندان کے ماورائے فطرت اور آسیبی روایتیں وابستہ رہی ہیں جو پشت بہ پشت بیان کی جاتی تھیں۔ انیس کا خاندان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھا۔

ان کے یہاں کی دو ایسی روایتیں ہم تک پہنچی ہیں۔ ان میں ایک کوٹھری کی پریوں کی اور ایک سر کٹے محبوب شاہ کی روایت ہے۔

پہلی روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے آشوب میں جب سپاہی گھروں کے اندر گھس کر من مانی کر رہے تھے اور کسی شہری کی جان، مال، آبرو محفوظ نہیں تھی، انیس کی دو پھپھیوں نے ایک کوٹھری میں مصلیٰ بچھا کر اپنی آبرو کی حفاظت کے لیے خدا سے دعا کی۔ اچانک کوٹھری کی زمین شق ہوئی اور دونوں اس میں سما گئیں۔ خاندانِ انیس میں ان دونوں بہنوں کا فاتحہ ہوتا تھا اور فاتحوں کی کتاب میں انھیں ''کوٹھری کی پریاں'' لکھا گیا ہے۔

دوسری روایت مختصراً یہ ہے کہ انیس کی زندگی میں گھر کی کسی شادی کے موقعوں پر زنان خانے میں مہمانوں کو کھانا کھلایا جا رہا تھا۔ اچانک دیکھا گیا کہ کھانا لانے والوں میں ایک بغیر سر کا بدن بھی ہے۔ اسے دیکھ کر عورتوں میں دہشت پھیل گئی اور بدن یہ کہہ کر غائب ہو گیا کہ میں محبوب شاہ ہوں۔ میرا فاتحہ کیا کرو۔ اس کے بعد سے انیس کے خاندان میں محبوب شاہ کے نام پر بھی فاتحہ دیا جانے لگا۔

مندرجہ بالا سطور میں انیس کی شخصیت کا مختصر خاکہ پیش کیا گیا۔ شخصیت کا مزید تعارف انیس کی داستان حیات میں ہوگا یہ فیض آباد سے شروع ہوتی ہے۔

☆☆..........☆☆

دوسرا باب

فیض آباد

شجاع الدولہ کے وقت تک فیض آباد اودھ کا دارالحکومت تھا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے آصف الدولہ نے دارالحکومت کو فیض آباد سے لکھنؤ منتقل کر لیا۔ اس کی بڑی وجہ اپنی والدہ بہو بیگم سے ان کی نا اتفاقی تھی۔ بہو بیگم کے پاس دولت بہت تھی۔ آصف الدولہ نے باپ کے ترکے کی حیثیت سے اس دولت کا مطالبہ کیا اور انگریزوں نے دخل اندازی کر کے ان کو بیگم سے ایک بڑی رقم اور دوسرا اسباب و جواہر دلوا دیا اور یہ معاہدہ ہو گیا کہ آئندہ وہ اپنی والدہ کی دولت اور جاگیر سے کوئی سروکار نہ رکھیں گے۔ اس طرح فیض آباد پر ایک طرح سے بہو بیگم کی حکومت ہو گئی اور آصف الدولہ لکھنؤ کی آبادی کی طرف متوجہ ہوئے۔

آصف الدولہ کی سخاوت ضرب المثل اور ہنر پروری مشہور تھی۔ اودھ میں قسمت آزمائی کے لیے آنے والے جو پہلے سیدھے فیض آباد پہنچتے تھے، اب ان کا رخ لکھنؤ کی جانب ہو گیا۔ اسی کے ساتھ لکھنؤ کی رونق اور فیض آباد کی بے رونقی کا دور شروع ہوا۔

۱۸۰۳ء تک فیض آباد کے بھی بیشتر ممتاز شہری لکھنؤ چلے گئے تھے لیکن کچھ امرا اور شعرا وہاں رکے بھی رہے۔ امرا میں آغا محمد تقی خاں ترقی جن کی شادی بہو بیگم کی پالی ہوئی ایک لڑکی سے ہوئی تھی، بہت ممتاز تھے۔ شاعروں میں جو لوگ اس وقت فیض آباد میں مقیم تھے ان میں میر ضاحک کے پوتے اور میر حسن کے بیٹے میر مستحسن خلیق بھی تھے جو ترقی سے وابستہ تھے۔

خلیق

اردو مرثیے کو ایک باقاعدہ صنفِ سخن کی حیثیت سے استحکام بخشنے والوں میں ضمیر، فصیح،

دیگر کے ساتھ خلیق کا نام بھی شامل ہے۔ ان کو سولہ سال کی عمر میں شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ میر حسن اس وقت لکھنؤ میں اور خلیق ان کے ساتھ تھے۔ انھوں نے نوعمر خلیق کو مصحفی کا شاگرد کرادیا۔

۲۴۔ اکتوبر ۱۷۸۶ء کو لکھنؤ میں میر حسن کی وفات ہوئی۔ اس کے بعد خلیق مہاراجا کے یہاں اتالیقی کرنے لگے۔ رائے کی وفات کے بعد خلیق لکھنؤ سے فیض آباد چلے آئے اور ترقی کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ وہ غزل گو شاعر کی حیثیت سے بہت ممتاز ہو چکے تھے اور انھوں نے بہت سے شاگرد بھی بنا لیے تھے۔ فیض آباد میں بھی سید محمد خان رند اور علی اوسط رشک ان کے شاگرد تھے۔

۲۸ دسمبر ۱۸۱۵ء کو فیض آباد کی کارفرما شخصیت بہو بیگم کی وفات کے بعد بہت سے لوگ جو بہو بیگم کی وجہ سے فیض آباد میں رکے ہوئے تھے، لکھنؤ چلے آئے۔ ان میں خلیق کے سرپرست ترقی بھی تھے لیکن خلیق نے فیض آباد کی سکونت ترک نہیں کی۔ علی اوسط رشک جب لکھنؤ جانے لگے تو خلیق نے ان کو شیخ ناسخ کی شاگردی میں دے دیا۔ رند بھی لکھنؤ چلے آئے اور خواجہ آتش کے شاگرد ہو گئے۔

فیض آباد میں رہنے کے باوجود خلیق کا میدان عمل لکھنؤ ہی تھا جہاں وہ برابر جاتے رہتے تھے۔ ۱۸۰۳ء تک وہ صاحب دیوان ہو چکے تھے اور مرثیہ گوئی بھی کرنے لگے تھے جس کی مجلسیں لکھنؤ میں بہت ہوتی تھیں۔

انیس

۱۸۰۳ء میں خلیق کے یہاں انیس کی ولادت ہوئی۔ ان کا نام میر سید ببر علی رضوی رکھا گیا۔ ان کی والدہ کا نام ہنگا بیگم تھا۔

انیس خلیق کی اولاد میں سب سے بڑے تھے۔ ان کے علاوہ خلیق کی دوسری اولاد میں میر مہر علی انس، میر نواب مونس، بندی بیگم، آبادی بیگم، ہرمزی بیگم شامل ہیں۔ انیس ابھی خردسال ہی تھے کہ خلیق کے یہاں میر مہر علی کی ولادت ہوئی اور ماں باپ کی توجہ اور محبت میں انیس کا ایک حصہ دار پیدا ہو گیا۔ خانوادگی نظام کی اصطلاح میں انیس اور مہر علی ''اوپر تلے'' کے بھائی تھے۔ اس

طرح کے بھائیوں کے درمیان فطری باہمی محبت کے علاوہ ایک طرح کی رقابت اور نااتفاقی بھی قائم ہو جاتی ہے اور ان دونوں بھائیوں کی نااتفاقی رہ رہ کے ابھرتی تھی۔ البتہ میر نواب مونس جو انیس سے بہت چھوٹے تھے، دونوں بھائیوں کے بڑے چہیتے تھے۔ دونوں بھائی انیس کو بھیا اور خلیق کو تینوں بھائی ''باباجان'' یا ''باواجان'' کہتے تھے۔

قریب انیس سال کی عمر میں انیس کی شادی ہوگئی۔ ان کی اہلیہ فاطمہ بیگم میر احمد علی رسالدار کی بیٹی تھیں۔ ان کی اولاد کے نام ترتیب ولادت کے اعتبار سے حسب ذیل ہیں:

۱۔ میر خورشید علی (نفیس) ۲۔ عباسی بیگم
۳۔ مہندی بیگم ۴۔ میر عسکری (رئیس)
۵۔ میر محمد ۶۔ آغائی بیگم

اساتذہ

انیس کے استادوں میں فیض آباد کے مشہور شیعہ عالم مولوی میر نجف علی صاحب کشف و کرامات مشہور تھے اور ان پر صوفی ہونے کا بھی الزام لگا تھا۔ انیس کے دوسرے اُستاد مولوی حیدر علی فیض آبادی ایک حنفی عالم تھے جو میر نجف علی کے شاگرد تھے۔ انیس کے استادوں میں حکیم میر کلو فیض آبادی کا نام بھی ملتا ہے جو فیض آباد کے بڑے فاضل اور علوم ادبیہ میں مشہور تھے، لیکن داڑھی منڈواتے تھے۔

استعداد

انیس کی علمی استعداد بہت اچھی تھی۔ عربی زبان، اس کے صرف ونحو اور معنی و بیان کے مسائل اور ان سے متعلق کتابوں کا بہ خوبی علم رکھتے تھے۔ ان کے یہاں عربی اقوال و امثال، عربی شاعروں کے حوالے، آیات و احادیث، تفسیر کی کتابوں اور ان کے راویوں کے حوالے وغیرہ موجود ہیں۔ وہ تاریخ اسلام پر بھی نظر رکھتے تھے۔ ان کو فارسی زبان وادب پر بڑا عبور حاصل تھا اور

وہ فارسی کی سادہ و رنگین نثر و نظم لکھنے پر قادر تھے۔

اودھی بھاکھا کے شاعروں میں ایک انیس کا ذکر ملتا ہے کہ وہ خود کو ہندو ظاہر کر کے ایک پنڈت سے وید پُران وغیرہ پڑھنے جاتے تھے۔ جب پنڈت کو ان کے مسلمان ہونے کا علم ہوا تو انھوں نے ان کو پڑھانے سے انکار کر دیا۔ اس پر انیس نے ان کے لیے ایک پد کہا جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

''اے چھتنار درخت، ہم آپ کے پھول ہیں۔ ہمیں ساتھ رکھیے گا تو ہم آپ کی رونق بڑھائیں گے۔ ہمیں چھوڑ دیجیے گا تب بھی ہم آپ سے جدا نہ ہوں گے۔ جہاں جہاں جائیں گے آپ کی شہرت پھیلائیں گے۔ سورماؤں کے سر چڑھیں گے، پیشانیوں پر جگہ پائیں گے۔ اے چھتنار انیس ہاٹ بازار میں خریدا جائے گا۔ ہم وطن میں رہیں یا پردیس میں کسی بھی بھیس میں رہیں، آپ ہی کے کہلائیں گے۔''

محض عالموں کا خیال ہے کہ یہ انیس میر ببر علی تھے۔

ہندی کے افسانہ نگار ادے پرکاش کے بیان کے مطابق ریاست ریوا کے رجواڑوں سارنگ گڑھ، سہاگ پور اور کوٹھی کے ہندو راجاؤں کے مسلمان اہل کاروں کے یہاں محرم کی مجلسوں میں اودھی زبان کے مرثیے پڑھے جاتے تھے جو انیس کے نام سے مشہور تھے۔ انیس کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو ہزاروں دوہرے یاد تھے اور وہ گفتگو میں ان کا برمحل استعمال کرتے تھے۔ ان کے علاوہ جائسی کی پدماوت اور تلسی داس کی رام چرت مانس پر بھی ان کی گہری نظر تھی جس کا ثبوت ان کے مرثیوں میں ملتا ہے۔

سپہ گری بھی انیس نے باقاعدہ سیکھی تھی۔ وہ بنوٹ کے ماہر اور تمام رائج الوقت اور قدیم ہتھیاروں سے واقف تھے۔ خواہ وہ عربی و ایرانی ہتھیار ہوں یا ہندوستانی۔ وہ ایک شہسوار کی طرح جنگی گھوڑوں کے اقسام، عادات، نفسیات اور ان سے متعلق اصطلاحوں سے بھی خوب

واقف تھے۔جس کا اندازہ ان کے مرثیوں کے رزمیہ حصوں سے ہوتا ہے۔

انیس کے زمانے میں اردو زبان باضابطہ نصاب میں شامل نہیں تھی۔ اس کے لیے خاندانی روایات، علمی ادبی ماحول، اہل ذوق کی صحبت اور ذاتی شوق وغیرہ درس گاہ کا کام کرتے تھے۔ انیس کو یہ سب چیزیں میسر تھیں۔ ان کے پردادا میر ضاحک، دادا میر حسن، باپ میر خلیق، بڑے چچا میر احسن خلق اور چھوٹے چچا میر احسان مخلوق، سب شاعر تھے۔ ان کے بچپن ہی میں ان کا گھرانا تاریخ ادب کا جز بن گیا تھا۔ ان حالات میں اگر انیس کو شعر و ادب کا ذوق نہ ہوتا تو یہ البتہ تعجب کی بات ہوتی۔

شاعری

انیس نے کم عمری ہی میں شاعری شروع کر دی تھی۔ شاعری میں ان کے استاد میر خلیق تھے۔ ناسخ کو بھی انھوں نے اپنا کلام دکھایا تھا۔ اس کا دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ ایک بار جب انیس خلیق کے ساتھ لکھنؤ میں تھے، خلیق کو لکھنؤ سے باہر جانا پڑا۔ وہ انس سے کہہ گئے کہ اپنا کلام ناسخ کو دکھالیا کریں۔ انیس نے غزل کہہ کر ناسخ کو پیش کی۔ انھوں نے پڑھ کر رکھ لی۔ دو تین دن انیس ان کے پاس گئے لیکن ناسخ نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر دوسری غزل لے کر گئے۔ وہ بھی ناسخ نے پڑھ کر رکھ لی۔ پھر ایک دن گئے اور آواز دی تو کوئی جواب نہ ملا مگر اندر سے کسی کے کوڑے مارنے کی آواز آ رہی تھی۔ انیس نے زور سے پکارا تو ناسخ نے اندر بلالیا۔ انیس نے دیکھا کہ چھینکے پر ایک کتاب رکھی ہے اور ناسخ اس کو کوڑے مار رہے ہیں۔ انیس نے اس کا سبب پوچھا۔ ناسخ نے بتایا کہ میں اس لغت میں رات بھر ایک لفظ تلاش کرتا رہا، نہیں ملا۔ انیس نے وہ لفظ پوچھا اور کتاب سے نکال کر دکھایا۔ ناسخ بہت خوش ہوئے اور دعا دی کہ خدا نظر بد سے بچائے۔ خلیق جب لکھنؤ واپس آئے تو انیس سے پوچھا غزل کہی تھی؟ انیس نے جواب دیا کہی تھی۔ شیخ ناسخ کو دکھائی۔ انھوں نے پڑھ کر رکھ لی۔ دوسری غزل کہہ کر لے گیا، وہ بھی پڑھ کر رکھ لی اور نہیں بنائی۔ خلیق انھیں

ساتھ لے کر ناسخ کے پاس گئے اور پوچھا کہ لڑکے کی غزل کیوں نہیں بنائی؟ ناسخ نے کہا کہ ''لڑکا ہے یا تمھارا قبلہ گاہ ہے۔ دیکھو تو اس غزل کو کیا بناؤں۔'' یہ کہہ کر غزل دے دی۔ اس کا مطلع تھا:

یہی باعث ہے اس بے رحم کے آنسو نکلنے کا
دھواں لگتا ہے آنکھوں میں کسی کے دل کے جلنے کا

انیس کا تخلص شروع میں حزیں تھا۔ ناسخ ہی نے اسے بدل کر انیس کروا دیا۔

نوجوانی میں انیس کچھ عرصے تک غزل کہتے رہے۔ ایک دن خلیق نے ان کی ایک غزل سن کر کہا کہ ''بھائی اب اس غزل کو سلام کرو اور اس شغل میں زورِ طبع صرف کرو جو دین دنیا کا سرمایہ ہے۔'' خیال ہے کہ یہ وہی غزل تھی جس کا یہ شعر مشہور ہے:

مثالِ ماہیِ بے آب موجیں تڑپا کیں
حباب پھوٹ کے روئے جو تم نہا کے چلے

اس طرح میں انیس کا مشہور سلام ہے:

گہنہ کا بوجھ جو گردن پہ ہم اٹھا کے چلے
خدا کے آگے خجالت سے سر جھکا کے چلے
انیس دم کا بھروسا نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

انیس کا کچھ غزلیہ کلام اب بھی محفوظ ہے لیکن اس میں اچھے شعر نہیں ہیں۔ البتہ ان کے سلاموں کے شعروں میں تغزل کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی غزلوں کے چیدہ چیدہ شعر اور مصرعے اپنے سلاموں میں کھپا لیے تھے۔

مرثیہ گوئی بھی انیس نے کم عمری میں شروع کر دی تھی۔ اُنیس سال کی عمر میں وہ فیض آباد کے رئیس مرزا محمد ابراہیم عرف مرزا سیدو کے یہاں جو ترقی کے بہنوئی تھے، دو سو روپے سالانہ پر مرثیہ خوانی کے لیے مقرر ہو گئے۔ مرثیہ گوئی میں بھی خلیق ہی انیس کے استاد تھے۔ انیس کے

مرثیے ''آج شبیرؑ پہ کیا عالم تنہائی ہے۔ میں جناب سکینہ شمر کو خنجر لیے امام حسین کی طرف بڑھتے دیکھ کر کہتی ہیں۔ ''شمر خنجر لیے آتا ہے مرے باپ کے پاس۔''خلیق نے اس کو یوں کر دیا۔ ''کوئی خنجر لیے آتا ہے مرے باپ کے پاس۔''

انیس نے مرثیہ گوئی میں غیر معمولی محنت کی۔ یہ بیان ملتا ہے کہ انھیں ''ابتدائی مشق میں اکثر مصرعوں کی ادھیڑ بن میں کئی کئی روز گزر جاتے تھے۔'' وہ لفظوں کے انتخاب اور نظم سخن میں غیر معمولی دقت اور غور و فکر سے کام لیتے تھے۔ ان کے مرثیوں سے ان کی فنی ریاضت کا سراغ ملتا ہے، اسی لیے انھوں نے ایک موقعے پر کہا تھا کہ مرثیہ کہنے میں '' کلیجا خون ہو کر بہ جاتا ہے۔''

مرثیہ خوانی کو انیس نے ایک باضابطہ فن بنا دیا تھا۔ ابتدا میں خلیق نے انھیں مرثیہ خوانی سکھائی تھی۔ خلیق مرثیہ خوانی میں لب و لہجے کے تغیرات کے علاوہ صرف چشم و ابرو کے اشاروں سے کام لیتے تھے۔ ان کے برخلاف ضمیر ہاتھوں کا بھی استعمال کرتے تھے۔ انیس نے کچھ انداز ضمیر کا بھی اپنایا اور دونوں کی آمیزش سے اپنے ذاتی طرزِ مرثیہ خوانی کو اس بلندی پر پہنچا دیا کہ ان کو عام طور پر بہترین مرثیہ خواں تسلیم کر لیا گیا۔ انیس کے حوالے سے فن مرثیہ خوانی کے اکتساب کی کچھ صورتوں کا ذکر ملتا ہے، مثلاً عورتوں اور جانوروں کی بولیاں سیکھنا، عورتوں کے بین سننا وغیرہ۔

ایک مرثیے کے مقطعے میں انیس کہتے ہیں:

گر دل میں تیرے مرثیہ گوئی کا ہے خیال   بس اے انیس حیدرؑ صفدر سے کر سوال

ذہن سلیم اپنے کرم سے عطا کرو

یا مرتضیٰ علیؑ مری حاجت روا کرو

ایک اور مقطعے کے مصرعے ہیں:

مقبول ہو اگر کوئی اس مرثیے کا بند   رتبہ مرا بھی شہ کے غلاموں میں ہو بلند

ہوں مبتدی صحیح و غلط کی خبر نہیں

جس سے خطا نہ ہو وہ ملک ہے بشر نہیں

ایک مصرع یہ ہے:

میرا بھی ذاکروں میں شہ دیں کے نام ہوا

پھر یہ دعا قبول بھی ہوتی ہے:

ہوا مداحوں میں سرورؑ کے ترا نام انیس

تو ہوا ذاکر شبیرؑ خوشا تیرا حال

اور ایک مقطعے میں اپنے متعلق پیشین گوئی کرتے ہیں:

ہو گا جہاں میں فرد عطاے امامؑ سے

یہ مقطعے انیس کی مرثیہ گوئی کے اس ابتدائی زمانے کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جب وہ فیض آباد میں رہ کر کوشش کر رہے تھے کہ ان کو مرثیہ گو کی حیثیت حاصل ہو جائے اور اس حیثیت میں ان کی انفرادی شناخت بھی قائم ہو جائے۔ ممکن ہے فیض آباد میں یہ شناخت آسانی سے قائم ہو گئی ہو، لیکن خلیق اپنے بیٹے کو لکھنؤ کے لیے تیار کر رہے تھے۔ اسی لیے انھوں نے انیس کو لکھنؤ کے میدان میں اتارنے سے پہلے اس کا بندوبست کر لیا تھا کہ انیس اور یہ شہر ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہ رہیں۔

☆☆............☆☆

تیسرا باب

لکھنؤ

مسعود حسن رضوی ادیب لکھتے ہیں:

''میر خلیق کا وطن فیض آباد تھا اور ان کا مستقل قیام وہیں رہتا تھا لیکن کچھ کچھ مدت کے لیے وہ لکھنؤ بھی آجاتے تھے۔''

یہ آنا جانا اور عارضی قیام زیادہ تر مرثیہ خوانیوں کے سلسلے میں ہوتا تھا، لیکن بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیق کی ایک سسرال لکھنؤ میں بھی تھی۔ مثلاً محسن علی محسن خلیق اور ان کے بیٹے میر انس کو لکھنؤ کا ''باشندہ'' بتاتے ہیں لیکن ان کے سب سے چھوٹے بیٹے مونس کا ''مولد'' لکھنؤ بتاتے ہیں۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ مونس کی ننہال لکھنؤ کی تھی اور خلیق کی ایک شادی لکھنؤ میں بھی ہوئی تھی۔

ایک بیان میں انیس کے خسر میر احمد علی کو لکھنؤ کے عاملوں میں بتایا گیا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ خود انیس کی سسرال بھی لکھنؤ ہی میں تھی اور لکھنؤ میں انیس کی شادی کرنا بھی خلیق کی اسی حکمتِ عملی کا جز تھا کہ لکھنؤ میں انیس کو اتارنے سے پہلے پہلے اس شہر سے انیس کا رشتہ استوار کر دیا جائے۔

خلیق لکھنؤ کی خاص خاص مجلسوں میں انیس کو بھی اپنے ساتھ لے جاتے تھے یعنی لکھنؤ میں خود خواندگی شروع کرنے سے پہلے انیس اس شہر کے ممتاز مرثیہ گویوں کی خواندگی، یہاں کی مجلسوں کی کیفیت اور اپنی مجلس کے ذوق سماعت کا ذاتی مشاہدہ کیے ہوئے تھے اور لکھنؤ ان کا اچھی طرح پہچانا ہوا شہر ہو گیا تھا، البتہ سربرآوردہ شاعروں سے چھلکتے ہوئے اس بیت السلطنت میں خود

کو پہنچوانا مشکل کام تھا، لیکن انیس کے لیے ان کی پہچان بنی بنائی موجود تھی۔ ان کے لیے یہ تعارف کافی تھا کہ وہ استاد غزل گو اور صفِ اوّل کے مرثیہ نگار میر مستحسن خلیق کے فرزند اکبر، اردو کی بہترین اور زبان ردِ عام مثنوی سحر البیان کے مصنف میر حسن کے پوتے اور میر ضاحک کی سی انوکھی اور افسانوی شخصیت کے پڑپوتے ہیں اور خود بھی شاعر ہیں۔ فلاں ابن فلاں کی غیر معمولی اہمیت کے اس دور میں وہ شاعر ابن شاعر ابن شاعر ابن شاعر تھے۔ یہ وہ امتیازی پہچان تھی جو شاید کسی دوسرے شاعر کو حاصل نہیں تھی۔ اس کا امکان ضرور ہے کہ کسی دوسرے گھرانے میں بھی چار پشت کی شعری روایت رہی ہو لیکن تسلسل کے ساتھ ضاحک، حسن اور خلیق کے سے نمودار شاعر اس روایت میں یقیناً موجود نہ تھے۔

خلیق کی بدولت اس وقت کے دونوں ادبی قطب ناسخ اور آتش بھی انیس پر مہربان تھے، حالانکہ خود ایک دوسرے کے حریف تھے۔ ناسخ کو ان کے مایہ ناز شاگرد علی اوسط رشک کا تحفہ خلیق ہی نے دیا تھا۔ لکھنؤ میں اپنے استاد مصحفی کے جانشین آتش کے ہوتے ہوئے خلیق کا اپنے شاگرد رشک کو ناسخ کی شاگردی اختیار کرنے کی ہدایت کرنا ناسخ کو خلیق کا ممنون اور مداح بنانے کے لیے کافی تھا لیکن خلیق نے اس پر بس کرنے کے بجائے اپنے بیٹے انیس کو ان کی خدمت میں اصلاح شعر کے لیے بھیج کر انھیں ناسخ کی خصوصی توجہ کا مستحق بنا دیا تھا۔ انیس کو ناسخ کے دیے ہوئے تخلص کی مناسبت سے ان کے دونوں بھائیوں کے تخلص انس اور مونس رکھے گئے۔ اس بات سے بھی ناسخ کا متاثر ہونا یقینی تھا۔

آتش خلیق کے استاد مصحفی کے شاگرد اور جانشین تھے۔ آتش کے بہت ممتاز اور معزز شاگرد نواب سید محمد خان رند فیض آباد میں خلیق کے شاگرد رہ چکے تھے۔ خود آتش خلیق کا ایک مطلع سن کر اپنی غزل پھاڑ چکے تھے اور یہ واقعہ ہماری ادبی تاریخ کا جز بن گیا ہے۔ خلیق آتش کے استاد بھائی تھے اور اس رشتے سے انیس اس آزاد منش اور بانکے شاعر کے بھتیجے ہوتے تھے۔

انھیں اسباب سے ہمیں شاعری کے یہ دونوں قطب لکھنؤ میں انیس کی پشت پناہی

کرتے نظر آتے ہیں۔ ان دونوں استادوں کے اور خود خلیق کے شاگردوں اور مداحوں کے وسیع حلقے تھے جن میں بہت سے امیر کبیر اور صاحبان اقتدار بھی تھے۔ یہ سب حلقے انیس سے کم وبیش واقف تھے۔

یہ پس منظر انیس کے حق میں ایسی سازگار فضا بنا دینے کے لیے کافی تھا کہ اہل لکھنؤ ان کو منبر پر دیکھنے سے پہلے ہی ان کے بارے میں حسنِ ظن رکھنے اور انھیں سننے کے مشتاق رہنے لگیں۔ انیس کو صرف یہ کرنا تھا کہ اس حسنِ فن کو صحیح ثابت کر دیں اور اس اشتیاق کو بڑھا دیں۔ اسی کے لیے انھوں نے فیض آباد میں برسوں ریاض کیا تھا اور اسی لیے لکھنؤ میں ان کی مرثیہ خوانی اور شہرت کا آغاز ساتھ ساتھ ہوا۔

لکھنؤ میں انیس کی مرثیہ خوانی کا آغاز ۱۸۲۶ء

انیس کی لکھنؤ میں مستقل سکونت امجد علی شاہ کے عہد (۱۸۴۲ء تا ۱۸۴۷ء) میں ہوئی اور عام خیال یہ ہے کہ اس زمانے سے پہلے انیس کو لکھنؤ میں شہرت حاصل نہیں تھی بلکہ انھوں نے لکھنؤ میں پڑھنا شروع ہی نہیں کیا تھا۔ حقیقت یہ نہیں تھی۔ نصیر الدین حیدر کے عہد (۱۸۲۷ء تا ۱۸۳۷ء) میں لکھنؤ میں میر سلامت علی مرثیہ خوانی میں انیس کے شاگرد ہو چکے تھے، یعنی نصیر الدین حیدر کے عہد میں انیس لکھنؤ میں پڑھ رہے تھے اور ان کا اندازِ مرثیہ خوانی ایسا مقبول ہو چکا تھا کہ میر سلامت علی نے اس فن میں ان کی شاگردی اختیار کر لی تھی۔

دراصل انیس نے لکھنؤ میں پہلی مجلس ۱۸ یا ۱۹ نومبر ۱۸۲۶ء (۱۸ ربیع الثانی ۱۲۴۲ھ) کو پڑھی۔ یہ غازی الدین حیدر کا زمانہ تھا۔ مجلسوں میں خلیق کے ساتھ انیس کو دیکھ دیکھ کر لوگوں کو انھیں سننے کا اشتیاق پیدا ہو گیا تھا جس کا اظہار وہ خلیق سے کیا کرتے تھے۔ ۱۸ ربیع الثانی کو اکرام اللہ خان کے امام باڑے میں خلیق کے پڑھنے کی مجلس تھی۔ میر ضمیر بھی شریک مجلس تھے۔ ان سے خلیق نے کہا کہ میں چاہتا ہوں آج آپ کے بھتیجے سے بھی کچھ پڑھواؤں۔ ضمیر نے اس کی تائید کی، خلیق

منبر پر گئے۔ مرثیہ پڑھا۔ مجلس کے بعد حاضرین سے کہا کہ حضرات نے اکثر میرے بیٹے کو سننے کی خواہش کی آج سن لیجیے۔ یہ کہہ کر انیس کو اشارہ کیا۔ انیس نے منبر پر جا کر پہلے یہ رباعی پڑھی:

بالیدہ ہوں وہ اوج مجھے آج ملا ظل علم صاحب معراج ملا
منبر پہ نشست سر پہ حضرت کا علم اب چاہیے کیا تخت ملا تاج ملا

پھر سلام کے چند شعر پڑھ کر مرثیہ شروع کیا:

جب حرم مقتلِ سرور سے وطن میں آئے اشکِ خوں روتے ہوئے رنج و محن میں آئے
سب سیہ پوش غم شاہ زمن میں آئے خاک اڑانے کو خزاں دیدہ چمن میں آئے
بال چہروں پہ تھے سنبل سے پریشاں سب کے
مثل گل چاک تھے ماتم میں گریباں سب کے

گرد تھا ناتوں کے ساداتِ مدینہ کا ہجوم رو کے چلاتے تھے سب ہائے حسینؑ مظلوم
سرنگوں آتے تھے سجاد حزین و مغموم ہاتھ اٹھا کر یہ بیاں کرتی تھی اُمّ کلثوم
دشت میں سید ابرار کو رو آئے ہم
اے مدینے ترے سردار کو کھو آئے ہم

یہ خوانندگی اتنی پر اثر تھی کہ انیس کی فوری شہرت ہوگئی اور بڑے بڑے امرا ان کو اپنے یہاں پڑھوانے لگے۔

انیس کی اس پہلی خوانندگی کی منصوبہ بندی خلیق نے بہت سوچ سمجھ کر کی تھی۔ انھوں نے یہ نہیں کیا کہ لکھنؤ میں انیس کی مرثیہ خوانی کے آغاز کا بہت پہلے سے اعلان کرتے اور اس میں لکھنؤ کے ممتاز شہریوں کو خاص طور پر مدعو کرتے۔ انھوں نے اپنے پڑھنے کی مجلس کے ضمیمے کے طور پر انیس کو بھی پڑھوا دیا، اس لیے کہ انیس لکھنؤ میں پہلی بار پڑھ رہے تھے اور اس کا امکان موجود تھا کہ ان کی خوانندگی سامعین کو متاثر نہ کر پاتی یا وہ اس تباہ کن رعب مجلس کا شکار ہو جاتے جو کسی میدان میں پہلی بار اترنے والے کو بعض اوقات بے دست و پا کر دیتا ہے۔ انیس ابھی تک فیض

آباد میں پڑھتے رہے تھے۔ لکھنؤ کے سامعین کے سامنے پڑھنے کی بات دیگر تھی۔ یہ شہر اعلیٰ درجے کے مرثیہ گویوں اور مرثیہ خوانوں کا گڑھ تھا اور یہاں کے سامعین ان سب کو سنے ہوئے تھے۔ اگر یہ اہتمامی مجلس ہوتی تو انیس کو لکھنؤ کے سامعین کے سامنے مرکزی حیثیت سے پورا مرثیہ پڑھنا ہوتا۔ اس صورت میں ان کی ناکام خوانندگی کا ہر طرف چرچا ہوتا اور ذکی الحس انیس کے لیے یہ ایسا صدمہ ہوتا جس سے سنبھلنے میں انھیں مدتیں لگ سکتی تھیں۔ خلیق کی مجلس میں یہ خطرات نہیں تھے۔ اگر انیس دیکھتے کہ ان کی خوانندگی خاطر خواہ اثر پیدا نہیں کر رہی ہے تو مختصر پڑھ کر منبر سے اتر آتے۔ سامعین بھی سمجھتے کہ باپ کے بعد منبر پر جانے کی وجہ سے وہ کھل کر نہیں پڑھ پا رہے ہیں۔ لیکن یہ سب اس صورت میں ہوتا جب انیس کا کلام اور طرز خوانندگی پسند نہ کیا جاتا۔ اب جب لوگوں نے دیکھ لیا کہ مرثیے کے میدان میں ایک اور باکمال صاحبِ طرز نے قدم رکھا ہے تو ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا جانے لگا۔

اس ضمنی مجلس کے بعد خاص انیس کے پڑھنے کی پہلی مجلس مفتی گنج کے ذیلی محلے تحسین گنج میں مصطفیٰ خاں کے یہاں ہوئی۔ نوبت رائے نظر بتاتے ہیں کہ ''اس کی شہرت'' دفعتاً تمام لکھنؤ میں پھیل گئی تھی۔

مرثیہ گویوں کی نئی نسل میں اس وقت دبیر سرفہرست تھے۔ یہ ممکن نہ تھا کہ انیس کو بالاتفاق دبیر سے بہتر کہنے والا مان لیا جائے، لیکن یہ بات عام طور پر تسلیم کر لی گئی کہ مرثیے کی خوانندگی کے فن میں انیس کا مدمقابل کوئی نہیں ہے۔

غازی الدین حیدر کا عہد

غازی الدین حیدر اپنے والد نواب سعادت علی خاں کے بعد مسند نشین ہوئے تھے۔ اپنے پیش رووں کی طرح وہ بھی رسمی طور پر مغل بادشاہوں کے نواب وزیر اور اودھ، برائے نام سہی، مغلیہ سلطنت کا صوبہ تھا۔ لیکن غازی الدین حیدر نے یہ کاغذی رشتہ ختم کر کے خود بھی

بادشاہی اختیار کرلی۔ اب اودھ صوبے سے سلطنت بن گیا۔ غازی الدین حیدر اس سلطنت کے پہلے بادشاہ تھے اور لکھنؤ ان کا بیت السلطنت تھا۔ باپ کی جمع کی ہوئی دولت ان کے تصرف میں تھی۔ انھوں نے لکھنؤ کی شان و شوکت بڑھانے کے لیے بے دریغ روپیا صرف کیا جس کا اثر یہاں کی ثقافت کے ہر شعبے، خصوصاً عزاداری پر پڑا۔ اودھ کے حکم رانوں اور عوام کو ابتدا ہی سے عزاداری میں خاص انہماک تھا، بادشاہی ہونے پر یہاں محرم کا زور شور اچانک بہت بڑھ گیا۔ لکھنؤ کے بہت بڑے ثقافتی اور مذہبی مظہر کی حیثیت رکھنے والے عزاداری سوز، نوحہ و ماتم، حدیث خوانی، مرثیہ خوانی، علم، تابوت، تعزیے کے شان دار جلوسوں، نقاروں، فوجی اور شاہی باجوں کی آوازوں اور تبرک کی رنگارنگیوں کے ساتھ شہر میں ہر طرف نظر آتی تھی۔ شاہی خاندان اور رئیسوں سے لیکر طوائفیں، غریب غربا اور فقیر تک اس کی رونق بڑھانے میں لگے رہتے تھے۔

غازی الدین حیدر کا زمانہ انیس کی زندگی میں اس لیے اہمیت رکھتا ہے کہ اسی زمانے سے انھوں نے لکھنؤ میں پڑھنا شروع کیا۔ دبیر اس وقت تک بہت مشہور ہو چکے تھے۔ احسن کا بیان ہے:

> ''میر انیس مرحوم خود فرماتے تھے کہ جب ہم نے لکھنؤ میں پڑھنا شروع کیا تو اس وقت وہ صاحب اس فن کے لکھنؤ میں نامی و گرامی تھے۔ ایک میر مداری صاحب جو پار میں رہتے تھے اور دوسرے مرزا اسلامت علی دبیر۔''

یہ میر مداری یقینی طور پر شیخ مداری ہیں جو انیس کے ابتدائی دور میں لکھنؤ کے مشہور پڑھنے والے تھے۔ انھوں نے غازی الدین حیدر کے زمانے میں تین دوسرے روضہ خوار منشی رمضانی، میر ملاقی اور مرزا مغل غافل کے ساتھ مل کر یہ طے کیا کہ روضہ خوانی اگر فارسی کے بجائے اردو میں کی جائے تو زیادہ مقبول ہوگی، چنانچہ انھوں نے مرثیوں کے بندوں کو اردو نثر کے ساتھ ربط دے کر پڑھنا شروع کیا جسے نثر خوانی یا نثاری کا نام دیا گیا اور اس طرز کو بہت مقبولیت حاصل ہوگئی۔ انیس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان چاروں نثر خوانوں میں شیخ مداری مرثیوں کے بند

پڑھنے میں بہت مشہور تھے۔ یہ بیان بھی ملتا ہے کہ انھوں نے لکھنؤ میں دبیر کے مقابل انیس کو بڑھاوا دیا اور یہ بھی کہ ابتدا ہی میں انیس کو سن کر شیخ مداری نے کہا تھا: '' خدا جانے آئندہ تم کیا قیامت کرو گے۔''

اس قیامت کا ایک مظہر یہ سامنے آیا کہ انیس کی خوانندگی کی وجہ سے مرثیہ خوانی کو اتنا فروغ حاصل ہوا کہ اس کے سامنے خود نثر خوانی دب کر رہ گئی۔

نصیر الدین حیدر کا عہد

انیس و دبیر کے ہم عمر نصیر الدین حیدر اپنے باپ غازی الدین حیدر کی وفات کے بعد تخت پر بیٹھے۔ وہ بے تحاشا خرچ کرنے والے اور مزاج کے لحاظ سے انتہا پسند بادشاہ تھے۔ عزاداری میں ان کو غیر معمولی انہماک تھا۔ ان کے عہد میں ایام عزا سرکاری حکم کے مطابق دس دن سے بڑھا کر پچاس دن یعنی شہداے کربلا کے چہلم (۲۰ صفر) تک کر دیے گئے۔ وہ بڑی شان کے ساتھ عزاداری کرتے تھے۔ سارے عملے اور امرا کو چہلم تک سیاہ یا نیلے کپڑے پہننے کا حکم تھا۔ خود چہلم تک فرش زمین پر سوتے اور برہنہ پا تعزیے کے جلوس میں جاتے تھے۔ دس دس روپے مہینا پر بارہ سو سید زادے ملازم اور تعزیہ خانوں میں تعینات تھے۔ سیکڑوں ذاکر اور مرثیہ خوان مجلسوں میں حاضر رہتے تھے۔ عشرہ محرم کے بعد سادات کو دس دس سیر حلوے کے کونڈے، شیر برنج کی بہت بڑی بڑی ہانڈیاں اور سیکڑوں کی تعداد میں طلائی اور نقرئی طوق و زنجیر تقسیم ہوتے تھے۔

مدت عزا چار گنا اور بڑھ جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ کم و بیش اسی تناسب سے مرثیہ خوانوں اور دوسرے مجلس پڑھنے والوں کی مانگ اور آمدنی بڑھ گئی۔ اس لحاظ سے نصیر الدین حیدر کا دورِ حکومت انیس کی زندگی میں بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔

لکھنؤ میں انیس اور غالب کی ملاقات کا بھی بیان ملتا ہے جس کا انکار غالب شناسوں نے اس غلط فہمی کے تحت کیا ہے کہ نصیر الدین حیدر کے عہد تک انیس نے لکھنؤ میں پڑھنا شروع

نہیں کیا تھا اور وہ اس شہر میں اس وقت تک غیر معروف تھے۔ غالب کے لکھنؤ میں قیام کی مدت مارچ ۱۸۲۶ء سے لے کر قریب سوا پندرہ مہینے یعنی جون ۱۸۲۷ء تک قرار پاتی ہے۔ اسی مدت کے درمیان نومبر ۱۸۲۶ء میں لکھنؤ میں مرثیہ خوانی کے بعد سے انیس کی شہرت کا زمانہ شروع ہوتا ہے، اس لیے غالب اور انیس کی ملاقات کو خارج از امکان نہیں سمجھنا چاہیے۔

نصیر الدین حیدر کی بادشاہی کے پہلے ہی سال ان کے وزیر اعظم معتمد الدولہ آغا میر معتوب ہو کر معزول کر دیے گئے۔ وہ خلیق کے بھی سرپرست تھے۔ خلیق کے ایک مرثیے میں ان کے لیے دعا ملتی ہے:

اے خلیق آ کے نہ روداد کہ اب اصغر کی

بلکہ تو یاں سے عناں توسنِ خامہ کی پھرا　　اور یہ کہہ کے بہ درگاہ خدا ہاتھ اٹھا

یعنی اے خالقِ جن و ملک و ارض و سما　　شاد رکھ معتمد الدولہ کو دنیا میں سدا

حشمت و جاہ فزوں سے گھڑی ہر دم ہووے

غم شبیرؑ سوا کچھ نہ اسے غم ہووے

آغا میر کی معزولی اور اعتماد الدولہ ولد میر فضلی علی خاں کی تین سالہ وزارت کے بعد آغا میر کے سیاہی حریف منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں کو وزارت ملی۔ انیس کے ایک مرثیے کے اس بند میں منتظم الدولہ کی تعریف اور ان کے لیے دعا کی گئی ہے:

اب میری دعا یہ ہے کہ اے قاضی حاجات

یہ منتظم الدولہ جو ہے محسن سادات

کرتا ہے بہت شہ کے محبوں کی مدارات

اور ماتم سرورؑ میں سدا کٹتے ہیں اوقات

یہ بند منتظم الدولہ کے یہاں انیس کی خوانندگی کی شہادت دیتا ہے۔ ان دونوں حریفوں کے خاندانوں سے انیس کے مراسم آخر تک رہے، خصوصاً منتظم الدولہ کے وارث منور الدولہ احمد علی

خاں کے بیٹے اشرف الدولہ نواب امجد علی خاں حضور انیس کے بڑے عقیدت مند تھے۔

امام باڑا شاہ نجف جسے غازی الدین حیدر نے بنوایا ان کی وفات کے بعد ان کی بیگم نواب مبارک محل کے زیر انتظام آ گیا تھا جنھوں نے یہاں تعزیہ داری اور مرثیہ خوانی کی مجلسوں وغیرہ کا خاص اہتمام کیا۔ انیس بھی نجف کے مرثیہ خوانوں میں مقرر کیے گئے اور مبارک محل نے ان کے لیے نسلاً بعد نسل چالیس روپے ماہوار وثیقہ معین کیا۔ انیس نے ایک مقطعے میں مبارک محل کے لیے اس طرح دعا کی تھی۔

کر حق سے انیس اب یہ دعا بادلِ پُرغم — یا قادر و یا حافظ و یا خالقِ عالم
نواب مبارک محل ثانی مریم — فیاض زماں فخرِ خواتینِ معظم
ہر لحظہ فزوں عزت و اقبال و حشم ہو
غم ہو تو فقط فاطمہ کے لال کا غم ہو

اس بند اور خلیق کے معتمد الدولہ والے بند کی بیتوں کی مماثلت ظاہر ہے۔

نصیر الدین حیدر ہی کے عہد میں ۱۸۳۴ء کے قریب ۲۵ رجب (ساتویں امام موسیٰ کاظم کی تاریخ شہادت) والی مجلس قائم ہوئی جو خاندان انیس کی اہم ترین مجلسوں میں شمار ہوتی ہے۔

ایک موقع پر انیس نے اپنی ایک مجلس میں شرکت کے لیے خود جا کر آتش کو مدعو کیا اور مرثیہ ''بہ خدا فارسِ میدان تہوّر تھا حر'' پڑھا۔ اس میں حسینی جماعت اور یزیدی لشکر کے آمنے سامنے آ جانے کے بعد کا منظر یوں بیان کیا:

ہو گئے سرخ شجاعت سے رخِ آلِ نبی — آئی ٹھنڈی جو ہوا بھول گئے تشنہ لبی
رن میں کڑکا ہوا بجنے لگے باجے عربی — یکہ تازوں نے کیا شور مبارز طلبی
اک گھٹا چھا گئی ڈھالوں سے سیہ کاروں کی
برق ہر صف پہ چمکنے لگی تلواروں کی

برچھیاں تول کے ہر غول سے خوں خوار بڑھے — نیزے ہاتھوں میں سنبھالے ہوئے اسوار بڑھے

تیر جوڑے ہوئے چلوں میں کماں دار بڑھے　　بولے شہ یاں سے ابھی کوئی نہ زنہار بڑھے

اَسدِ حق کے گھرانے کا یہ دستور نہیں

میں نبیؐ زادہ ہوں سبقت مجھے منظور نہیں

یہ سخن کہ کے مخاطب ہوئے اعدا سے امام　　اے سپاہ عرب و روم و رے و کوفہ وشام

تم پہ کرتا ہے حسینؑ آخری حجت کو تمام　　پسر مصحف ناطق ہوں سنو میرا کلام

سخن حق کی طرف کانوں کو مصروف کرو

شور باجوں کا مناسب ہو تو موقوف کرو

سنتے ہی آتش اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور کہا، سبحان اللہ، واہ۔اس سے زیادہ مرثیے کی ترقی کیا ہوگی۔'' اس کے بعد سے جو بھی آتش سے ملنے جاتا اس سے انیس کی تعریف کرتے۔

میر ضمیر کی اہلیہ کی مجلس چہلم میں انیس پڑھ رہے تھے:

تھا فوج قاہرہ میں تلاطم کہ الحذر　　تھیں موج کی طرح سے ادھر کی صفیں ادھر

چکر میں تھی سپاہ کہ گردش میں تھا بھنور　　پانی میں تھے نہنگ ابھرتے نہ تھے مگر

فوجیں فقط نہ بھاگی تھیں منھ موڑ موڑ کے

دریا بھی ہٹ گیا تھا کنارے کو چھوڑ کے

آتش بھی مجلس میں موجود تھے اور وجد کے عالم میں جھوم رہے تھے۔تلوار کی تعریف میں یہ بیت پڑھنے سے پہلے انیس نے ان سے کہا کہ اس بیت کی داد آپ سے چاہتا ہوں:

اشراف کا بناو رئیسوں کی شان ہے

شاہوں کی آبرو ہے سپاہی کی جان ہے

تو آتش نے نصف قد سے کھڑے ہو کر کہا کہ شاعری کا تاج تمھارے سر کے لیے بنایا گیا ہے۔

انیس کے بارے میں آتش کا یہ قول بھی نقل ہوا ہے کہ ''میر خلیق کا لونڈا آفتیں ڈھا رہا ہے۔''

انیس اور میر ضمیر

اکرام اللہ خاں کے امام باڑے میں انیس کی پہلی خوانندگی کے لیے خلیق نے ضمیر سے رسمی اجازت لی تھی۔ اس طرح انیس کو میدان میں اتارنے والوں میں ضمیر بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اپنی اہلیہ کی مجلس ضمیر نے اپنے سب سے نامور شاگرد دبیر کے بجائے انیس سے پڑھوائی۔ اس کا ایک سبب یہ ہوسکتا ہے کہ ایک مرثیے کی خوانندگی کے قضیے میں ضمیر نے ناراض ہو کر دبیر سے قطع تعلق کر لیا تھا اور اس زمانے میں دبیر کی شہرت کو دبانے کی بھی کوشش کی تھی۔ اپنی اہلیہ کی مجلس انیس سے پڑھوا کر ضمیر نے گویا ان کی اہمیت کا اعلان کر دیا۔ ضمیر اور خلیق دونوں مصحفی کے شاگرد یعنی آپس میں استاد بھائی تھے۔ ضمیر کے فرزند متبنیٰ کی شادی خلیق کی بیٹی کے ساتھ ہوئی تھی اور یہ دونوں استاد آپس میں سمدھی تھے۔ یہ حالات ضمیر کو انیس پر مہربان رکھنے کے لیے کافی تھے۔ خود انیس مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی میں ضمیر سے جتنے متاثر تھے۔ اتنے خلیق سے نہیں تھے۔ مرثیہ گوئی میں انیس نے جن رزمیہ اور بیانیہ عناصر کو معراج کمال پر پہنچا دیا ان کے ابتدائی نقوش خلیق سے زیادہ ضمیر کے یہاں ملتے ہیں اور انیس کے کلام میں کہیں کہیں بہت واضح طور پر ضمیر سے استفادہ نظر آتا ہے مثلاً:

ضمیر: جس دم نہ رہا بیٹھنے کا گھوڑے پہ یارا ناگاہ گرا خاک پہ وہ عرش کا تارا

انیس: نہ رہا جب کہ ٹھہرنے کا فرس پر یارا گر پڑا خاک پہ وہ عرش کا تارا

ضمیر: سو مجھ کو ملا خلعتِ پر خون شہادت

انیس: جب حر کو ملا خلعتِ پر خون شہادت

ضمیر: واں ابن سعد سر پہ لگائے ہے چترِ زر ہاں ابنِ فاطمہؑ پہ نہیں سایۂ شجر

انیس: سر پر لگائے تھا پسر سعد چتر زر فرزندِ فاطمہ پہ نہ تھا سایۂ شجر

ضمیر: پہچانتے ہو کس کی ہے سر پر مرے دستار دیکھو تو عبا کس کی ہے کاندھے پہ نمودار
یہ کس کی زرہ کس کی سپر کس کی ہے تلوار میں جس پہ سوار آیا ہوں کس کا ہے یہ رہوار

انیس: یہ قبا کس کی ہے بتلاؤ یہ کس کی دستار یہ زرہ کس کی ہے پہنے ہوں جو میں سینہ فگار
بر میں ہے کس کا یہ چار آئنہ جوہر دار کس کا رہوار ہے یہ آج میں جس پر ہوں سوار

اس طرح انیس کو ضمیر کا معنوی شاگرد کہا جا سکتا ہے۔

محمد علی شاہ کا عہد

۷ جولائی ۱۸۳۷ء کو پراسرار بادشاہ نصیرالدین حیدر نے پراسرار حالات میں وفات پائی۔ ان کی والدہ بادشاہ بیگم نے ان کے کم عمر بیٹے فریدوں بخت عرف مناجان کو انگریزوں کی مرضی کے خلاف تخت پر بٹھا دیا۔ خاصی خوں ریزی کے بعد انگریزوں نے انھیں اتار کر نصیرالدین حیدر کے بوڑھے چچا محمد علی شاہ کو تخت نشین کر دیا۔ ان کے تعمیری کاموں میں حسین آباد کا امام باڑا اور متعلقہ عمارتیں ہیں۔ امام باڑے کے سامنے انھوں نے ایک لمبی سڑک بنوائی جس پر دورویہ روشنی کا انتظام تھا۔ سڑک کے دونوں طرف خوب صورت عمارتیں اور جانوروں کے رمنے تھے۔ شام کو یہاں گزری بازار لگتا تھا جس کا تفصیلی ذکر دلگیر نے کئی نظموں اور رجب علی بیگ سرور نے ''فسانہ عجائب'' میں کیا ہے۔

حسین آباد کا یہ علاقہ اور امام باڑہ شہر کا بڑا ثقافتی اور عزائی مرکز بن گیا تھا۔

۱۸۳۸ء-۱۸۳۹ء (۱۲۵۴ھ) میں انیس کے دو استادوں ناسخ اور میر نجف علی کی وفات ہو گئی۔ ان دونوں بزرگوں اور انیس کے مزاجوں میں کچھ مماثلتیں نظر آتی ہیں۔ ناسخ کی ذہنی بے اعتدالیوں کے جو قصے ملتے ہیں ان میں کئی کا تعلق اس سے ہے کہ وہ ملاقاتیوں خصوصاً خلافِ وقت آنے والوں سے بہت الجھتے تھے اور یہ کہ وہ بڑے وضع دار تھے۔ انیس بھی مقررہ اوقات کے سوا آنے والوں سے ملنا پسند نہیں کرتے تھے اور ان کی وضع داری ضرب المثل تھی۔

میر نجف علی پر صوفی ہونے کا الزام لگا تھا اور وہ صاحبِ کشف و کرامات بھی مشہور تھا۔ انیس کو بھی صوفی عقائد کا حامل ٹھہرایا گیا تھا اور انھیں بھی صاحبِ کشف سمجھا جاتا تھا۔

اس زمانے تک انیس جو مرثیے کہہ چکے تھے ان میں بعض کا علم ہمیں ان کی مورخ نقلوں سے ہوتا ہے۔ان مرثیوں کے کچھ مقطعوں میں انیس کی فنی صورت حال کے متعلق اشارے ملتے ہیں مثلاً:

گر قدرداں ہیں کم تو نہ کر اتنا اضطراب جلدی مدد کریں گے شہ آسماں جناب
تو ذاکر حسین علیہ السلام ہے
تیری انہی کو فکر ہے جن کا غلام ہے

....

کس پر ہے انیس ایسا کرم رب غنی کا شہروں میں ہے شہرہ تری شیریں سخنی کا

....

خاموش انیس آگے ساعت کی نہیں تاب جاری عوض اشک ہوا چشم سے خوناب
کم گوئی سے تیری ہے بجا شکوہ احباب کردے گا خدا مرثیہ گوئی کا بھی اسباب
غمگیں نہ ہو آقا تری امداد کریں گے
مداح ہے جن کا وہ مجھے یاد کریں گے

....

اب وقت خموشی ہے انیس جگر افگار بے تاب ہیں رقت سے شہ دیں کے عزادار
مولا سے یہ کر عرض کہ یا سید ابرار ہوں آپ کی سرکار سے عزت کا طلب گار
برگشتہ زمانہ ہے مدد کیجیے مولا
ناقدروں کے احساں سے بچا لیجیے مولا

یہ مقطعے بتا رہے ہیں کہ ایک وقت میں انیس کو اپنے قدردانوں کی تعداد کم معلوم ہوتی تھی اور وہ خود کو ایسے لوگوں کا بھی مرہون منت ہونے پر مجبور پا رہے تھے جنھیں وہ اپنے کلام کا صحیح قدردان نہیں سمجھتے تھے۔ان کی شہرت کئی شہروں میں پھیل چکی تھی لیکن ان کا مرثیہ کہنا کم ہو گیا تھا جس کی ان کے احباب شکایت کرتے تھے۔لیکن کم گوئی کا ایک مطلب یہ بھی نکلتا ہے کہ اب انیس کو جس رفتار سے مجلسیں پڑھنے کی دعوتیں مل رہی تھیں اس کے مطابق وہ نئے مرثیے نہیں کہہ پا رہے تھے۔

کم گوئی، زمانے کی برگشتگی اور اپنے مقدس ممدوح سے امداد طلبی انیس کے اس مسدس ترجیع بند کے بھی موضوع ہیں جس کی ترجیع کی بیت یہ ہے:

اب مدد کیجیے دم امداد ہے   یا امیر المومنین فریاد ہے

اس منقبت کے کچھ مصرعے یہ ہیں:

ہے مدد کا وقت یا شاہ نجف
اک طرف میں ہوں زمانہ اک طرف

یہ زمانہ برسر بیداد ہے
طبع کو مولیٰ روانی دیجیے

دل کو شوقِ مدح خوانی دیجیے
عاجز و حیران و مضطر ہے انیس

اس منقبت کا بیشتر تعلق انیس کی باطنی دنیا اور مزاجی کیفیت سے ہے۔ انیس کو یہ شکایت ہمیشہ رہی کہ ان کی قرارواقعی قدر نہیں کی جا رہی ہے اور زمانہ ان کے ساتھ موافقت نہیں کر رہا ہے۔ لیکن لکھنؤ میں شروع ہی سے ان کو نمایاں حیثیت حاصل تھی اور اس شہر کے اکابران کی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ ان میں ایک اہم نام نواب عاشور علی خاں کا تھا جو شجاع الدولہ کے پوتے اور اپنے عہد کی انوکھی شخصیت تھے۔ غزلوں میں عشقیہ مضمون شاید بالکل نظم نہیں کرتے تھے۔ اعتقادی شعر زیادہ کہتے تھے۔ مشاعروں میں شرکت کرتے لیکن کلام نہیں سناتے تھے۔

نواب حسین علی خاں اثر آصف الدولہ کے نائب امیر الدولہ حیدر بیگ کے بیٹے اور لکھنؤ کے نام ور رئیس تھے۔ اثر چہلم تک روزانہ مجلس کرتے اور ایک دن دبیر کو، ایک دن انیس کو پڑھواتے تھے۔

☆☆............☆☆

چوتھا باب

امجد علی شاہ کا عہد

۱۸۴۲ء میں محمد علی شاہ کی وفات کے بعد ان کے دیں دار اور پابند شرع بیٹے امجد علی شاہ اودھ کے تخت پر بیٹھے ان کے عہد میں انیس نے لکھنؤ کی مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ان کی منتقلی کی بڑی اور شاید اصل وجہ یہاں ان کی بڑھتی ہوئی شہرت اور مانگ تھی۔ محمد علی شاہ کے عہد میں بلکہ اس سے پہلے بھی انیس کے جن مرثیوں کی نقلیں تیار کر لی گئی تھیں ان کے کچھ بند درج ذیل ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت انیس فیض آباد سے آ کر اپنے مخصوص انداز میں کیا پڑھتے اور واپس چلے جاتے تھے۔

۱۸۴۳ء ''جب جنگ کے میداں میں سدھارے علی اکبر'' مطلع ثانی: ''اے مومنو اولاد کا مرنا بھی ستم ہے۔''

یوں ڈھونڈھتا تھا بیٹے کو وہ صاحب شمشیر بے تاب ہو جس طرح سے بچے کے لیے شیر
آمادہ تھے مرجانے پہ دل زیست سے تھا سیر فرماتے تھے ہے سارا جہاں آنکھ میں اندھیر
تھا صدمۂ جاں کاہ شہ جن و بشر پر
اک ہاتھ جگر پر تھا اور اک ہاتھ کمر پر

۱۸۴۸ء ''مشرق سے صبح کی جو سپیدی عیاں ہوئی''

تیغیں کھنچیں نیام سے نیزے ہوئے علم طبلِ وغا پہ لگنے لگی چوب دم بہ دم
کوس و دف و جلاجل و قرنا بجے بہم تا گنبد فلک گئی آواز زیر و بم
سن کر یہ شور شہ نے کہا کردگار شکر
نوبت ہمارے قتل کی پہنچی ہزار شکر

۱۸۳۹ء ''جب طوق و سلاسل میں مسلسل ہوئے عابد''

اس شکل سے صحرا میں پڑے تھے وہ دلاور　　جس طرح مرقع کہیں ہو جاتا ہے ابتر
سوتے تھے کہیں خاک پہ دو بھائی برابر　　دولھا کوئی پامال تھا گھوڑوں سے سراسر
بُندے کوئی پہنے ہوئے پیارا سا پڑا تھا
ریتی پہ کوئی طفل ستارہ سا پڑا تھا

سوتا تھا لب نہر کوئی ہاتھ کٹائے　　تھا خواب اجل میں کوئی پھل برچھی کا کھائے
تھے جسم لہو میں عوض غسل نہائے　　اتنا بھی نہ تھا کوئی کہ قبریں تو بنائے
دم نکلے تھے مشکل سے کہ وہ تازہ جواں تھے
بالائے زمیں پاؤں رگڑنے کے نشاں تھے

....

ٹکراتے تھے جب کوہ تو اُڑتے تھے شرارے　　چلتے تھے درختوں پہ غم و درد کے آرے
جو کھیت لہکتے تھے وہ مرجھائے تھے سارے　　اور لوٹتی تھیں مچھلیاں دریا کے کنارے
دانے کا نہ تھا ہوش پرندوں کو جہاں میں
چوپائے نہ منھ ڈالتے تھے آب رواں میں

۱۸۳۹ء ''آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے۔''

زین سے ہوتا ہے جدا دوش محمد کا مکیں　　چمنِ فاطمہ کا سرو ہے مائل بہ زمیں
برچھیاں گرد ہیں اور بیچ میں وہ سرور دیں　　ہے یہ نزدیک گرے مُہر نبوت کا نگیں
پاؤں ہر بار رکابوں سے نکل جاتے ہیں
یا علی کہتی ہے زینب تو سنبھل جاتے ہیں

لاکھ شمشیریں ہیں اور ایک تن اطہر ہے　　ایک مظلوم ہے اور ظالموں کا لشکر ہے
سیکڑوں خنجر فولاد ہیں اور اک سر ہے　　نہ کوئی یار نہ ہمدم نہ کوئی یاور ہے

باگ گھوڑے کی لٹکتی ہے اٹھا سکتے نہیں
سامنے اہل حرم روتے ہیں جا سکتے نہیں

۱۸۴۰ء ''ہوتے ہیں بہت رنج مسافر کو سفر میں'' (درحال یتیمانِ مسلم)

جو مالک زنداں تھا وہ آتا تھا سر شام | فاقے میں بسر کرتے تھے دن بھر وہ گل اندام
دیتا انھیں دو روٹیاں اور پانی کے دو جام | جا بیٹھتے دروازے کے نزدیک وہ گل فام
تھا خوف زبس ظالم اظلم کے غضب سے
اٹھ اٹھ کے سلام اس کو وہ کرتے تھے ادب سے

۱۸۴۱ء ''جب نو جواں پسر شہ دیں سے جدا ہوا۔''

جھیلوں میں شیر ہانپتے تھے دشت میں ہرن | وہ لوں وہ آفتاب کی تابندگی وہ بن
غل تھا خدا پرستوں کے لاشے میں بے کفن | رونے کی چار سو تھی صدا بولتا تھا رن
آندھی میں خاک اڑتی تھی گھوڑوں کی گشت سے
آواز ہائے ہائے کی آتی تھی دشت سے

....

دو دن کی راہ کرتا تھا ایک ایک دن میں طے | سرکو قدم کیے وہ سعید خجستہ پے
آسان تھی اس کو دوری شام و عراق و رے | پیاری نہ تھی جو قطع مسافت سے کوئی شے
ان جنگلوں میں بادیہ پیما تھا دین کا
گھر بن گیا تھا راہ خدا کی زمین کا

تنہا کھڑا ہے ایک مسافر لہو میں لال | پہنچا جو کربلا میں تو دیکھا یہ اس نے حال
چلتے ہیں تیر کرتا ہے پانی کا جب سوال | فوجیں ستم کی گرم ہیں آمادۂ قتال
از بسکہ اہل درد تھا بے تاب ہو گیا
پانی کے مانگنے پہ جگر آب ہو گیا

کہنے لگا لرز کے وہ ذی قدر نیک نام اللہ کس قدر ہے پرآشوب یہ مقام
دریا خدانے خلق کیے بہر فیض عام مرتا ہے بے اجل یہ ستم کش یہ تشنہ کام
ان سے بشر ڈرے جنھیں خوف خدا نہیں
جلدی نکل چلو یہ ٹھہرنے کی جا نہیں

لکھنؤ میں انیس کی مستقل سکونت

لکھنؤ میں انیس کی بڑھتی ہوئی شہرت کا لازمی نتیجہ یہ ہونا تھا کہ یہاں ان کے پڑھنے کی مجلسوں کی تعداد بڑھنے لگے اور ان کو مجلس پڑھنے کے لیے بار بار فیض آباد سے لکھنؤ آنا پڑے۔ ان دونوں شہروں کے درمیان چار دن کی مسافت تھی۔ فیض آباد سے لکھنؤ آ کر مجلس پڑھنے اور پڑھ کر فیض آباد واپس جانے کا آٹھ دن کا تھکا دینے والا سفر، ایک دن مجلس کا اور آنے جانے کے بعد کم از کم ایک دن آرام کا ملا کر تقریباً گیارہ دن کا حساب بنتا ہے۔ یعنی اگر انیس کو ایک ہفتے کے فصل سے لکھنؤ میں دو مجلسیں پڑھنا ہوتیں تو ان کے لیے دو مرتبہ فیض آباد سے آنا ممکن نہ ہوتا اور دونوں مجلسوں کے درمیان کے سات دن ان کو لکھنؤ ہی میں گزارنا ہوتے۔ عزاداری کی مدت میں توسیع کے بعد سے مجلسوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے علاوہ سال کے دوسرے مہینوں میں بھی مجلسوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اماموں اور دوسرے بزرگان دین کی وفات کی تاریخوں پر مجلسیں اور ان سے بہت زیادہ سوئم، چالیسویں، برسی، ویسے اور منت کی مجلسیں تواتر کے ساتھ ہوا کرتی تھیں اور ان میں زیادہ تر مرثیہ خوانی ہی ہوتی تھی۔ اتنی مجلسوں میں سے انیس کے حصے میں جتنی بھی مجلسیں آتی ہوں انھیں پڑھنے کے لیے بار بار فیض آباد سے آنا مشکل اور سخت موسموں، خصوصاً برسات میں قریب قریب ناممکن تھا اور اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ وہ اپنی مختلف مجلسوں کا درمیانی زمانہ بھی لکھنؤ میں گزاریں اور اس طرح لکھنؤ میں ان کے قیام کی مدت بڑھتی جائے۔ نوبت رائے نظر کا یہ بیان اسی صورت حال کو دکھاتا ہے:

''اب تک ان کا وطن فیض آباد تھا..... اور لکھنؤ صرف مجلسیں پڑھنے آیا کرتے تھے، گو فیض آباد کی نسبت لکھنؤ میں زیادہ قیام رہتا تھا کیونکہ یہاں مجالس کے چرچے بے انتہا بڑھے ہوئے تھے، لیکن یہ قیام مسافرانہ قیام تھا۔''

لکھنؤ میں زیادہ قیام رہنے کا مطلب یہ ہے کہ اب فیض آباد میں انیس کا قیام مسافرانہ سا رہ گیا تھا۔ لکھنؤ میں انیس کے سکونت اختیار کرنے کے کچھ ضمنی محرکات بھی ہو سکتے ہیں، لیکن اصل سبب یہی ہو سکتا ہے کہ امجد علی شاہ کا زمانہ آتے آتے لکھنؤ میں انیس کی طلب اتنی بڑھ گئی تھی کہ اب ان کا تھوڑے دنوں تک بھی فیض آباد میں رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس لیے انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ اہل و عیال سمیت مستقلاً لکھنؤ کی سکونت اختیار کر لیں۔

انیس کی روزی کا ذریعہ مرثیہ خوانی اور لکھنؤ ان کا روزی رساں شہر تھا۔ لیکن انھوں نے اس شہر کو اپنا وطن ثانی بنانے میں بہت دیر کی۔ وہ پہلے ہی لکھنؤ منتقل ہو سکتے تھے لیکن یہ ان کا حصول معاش کے لیے اور محض اپنے مفاد کی خاطر منتقل ہونا کہا جا سکتا تھا۔ انیس غالباً یہ چاہتے تھے کہ پہلے لکھنؤ کو اچھی طرح اپنا مشتاق بنا لیں یہاں تک کہ یہ شہر خود انھیں اپنے دامن میں لینے کا متمنی ہو جائے۔ شاد بتاتے ہیں:

> ''لکھنؤ کے لوگوں سے وعدے ہو گئے تھے کہ مع عیال اب لکھنؤ ہی میں آ کر رہوں گا۔ چنانچہ تھوڑے ہی دن میں وطن کو خیر باد کہا اور مع عیال لکھنؤ میں چلے آئے۔''

اس طرح انیس کا لکھنؤ میں آ رہنا گویا اپنی مرضی سے نہیں بلکہ اہل لکھنؤ کی خواہش کی وجہ سے تھا، جس طرح لکھنؤ میں ان کی مرثیہ خوانی کا آغاز اس وقت ہوا جب اہل شہر انھیں سننے کی خواہش ظاہر کرنے لگے تھے۔ اسی لیے جب انیس کو معاش کی خاطر دوسرے شہروں میں جا کر مرثیہ خوانی کرنا پڑی تو انھوں نے ناراض ہو کر لکھنؤ میں پڑھنا چھوڑ دیا۔

امجد علی شاہ کا زمانہ سلطنت ۱۸۴۲ء تا ۱۸۴۷ء ہے۔ انیس کے ایک مرثیے کے ترتیے

میں جو ۶ اگست ۱۸۴۶ء کو نقل کیا گیا تھا انھیں ''فیض آباد محلہ راٹھ حویلی'' کا ساکن لکھا گیا ہے۔ سعادت خان ناصر کا تذکرہ ''خوش معرکۂ زیبا'' بھی اسی زمانے میں لکھا گیا لیکن اس میں بھی انیس کو ساکن لکھنؤ نہیں بتایا گیا ہے۔ کئی برس بعد اس تذکرے میں اضافے ہوئے اور انیس کے حالات میں ان کے لکھنؤ آ جانے کا بھی ذکر کیا گیا۔ اس سے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ امجد علی شاہ کی حکومت کے آخری سال تک انیس لکھنؤ منتقل نہیں ہوئے تھے لیکن خلیق کے حالات میں ہم دیکھتے ہیں کہ ۲۶ مئی ۱۸۴۴ء تک انیس لکھنؤ منتقل ہو چکے تھے۔ اس طرح منتقلی کا زمانہ اشتباہ کا شکار ہو جاتا ہے اور اسی اشتباہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انیس کی منتقلی کسی مخصوص تاریخ کو نہیں ہوئی۔ بلکہ یہ ایک تدریجی سلسلۂ عمل تھا جو کئی برسوں کو محیط ہو سکتا ہے۔ مجلسوں کی کثرت کی وجہ سے ان کا لکھنؤ میں قیام زیادہ رہنے لگا تھا یعنی ان کی ایک گھر داری لکھنؤ میں بھی تھی۔ رفتہ رفتہ فیض آباد کی گھر داری بھی لکھنؤ منتقل ہو گئی۔ فیض آباد کا جانا انھوں نے مطلقاً ترک نہیں کر دیا تھا۔ اس صورت میں فطری بات ہے کہ کچھ لوگ ان کو لکھنؤ منتقل ہو جانے کے بعد بھی ساکن فیض آباد سمجھتے رہے ہوں اور کچھ لوگ انھیں منتقلی سے پہلے ہی ساکن لکھنؤ سمجھنے لگے ہوں۔

لکھنؤ میں انیس کی قیام گاہیں

لکھنؤ میں انیس نے مختلف زمانوں میں مندرجہ ذیل محلوں میں سکونت اختیار کی:

۱۔ شیدیوں کا احاطہ: یہ بڑے محلے سبٹی کا ایک اندرونی محلہ تھا۔ شروع میں انیس کا قیام شیدیوں کے احاطے میں ہوا۔

۲۔ نخاس: شیدیوں کے احاطے کے بعد انیس نے نخاس میں قیام کیا۔

۳۔ سبٹی: دیانت الدولہ نے سبٹی میں انیس کے لیے دو مکان اور ایک امام باڑا بنوا دیا اور انیس وہاں اٹھ آئے۔

۴۔ منصور نگر: انزاعِ سلطنت کے بعد انیس کو سبٹی کی سکونت ترک کرنا پڑی اور اپنے

ایک شاگرد مرزا محمد عباس کے مکان واقع منصور نگر میں منتقل ہو گئے۔

۵۔ پنجابی ٹولا (بیگم گنج، راجا بازار): آشوب ۱۸۵۷ء کے بعد لکھنؤ میں حالات معتدل ہوئے تو انیس نے اس علاقے میں مکان لیا۔

۶۔ چوبداری محلّہ، چوک: یہ انیس کی آخری قیام گاہ تھی۔ یہیں ان کی وفات ہوئی۔

(ان قیام گاہوں کے متعلق دوسری تفصیل انیس کے آئندہ حالات میں بیان ہوگی) اس طرح لکھنؤ میں انیس کے کم از کم چھ مسکن ہوئے۔ شاید اسی لیے انھوں نے ایک رباعی میں کہا تھا:

کیا پوچھتے ہو مقام و مسکن میرا
مانند حباب خانہ بردوش ہوں میں

....

منیر شکوہ آبادی کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امجد علی شاہ کے ابتدائے سلطنت ہی میں انیس کو مستند زبان داں کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی اور اس وقت خلیق زندہ تھے۔

''آیا وہ مباحثہ طولانی جو ثریا جاہ بادشاہ (امجد علی شاہ) کے عہد میں بین الشعرا ہوا تھا نہیں سنا؟ اور ''بندہ نواز'' بروزن مفعولان اور ''بندھنوار'' بروزنِ مفاعیل کی تحقیق تھی تو اکثر اکابر فن نے میر خلیق صاحب سے اور میر انیس سے بھی استفسار کیا تھا۔ آخر کو بعض اساتذہ نے اپنا شعر کاٹ دیا تھا۔''

امجد علی شاہ کی تخت نشینی کے قریب پینتیس دن بعد انیس کی ہمشیرہ، ہرمزی بیگم کی شادی میر رضا حسین عرف میر صفدر حسین سے ہوئی جو ضمیر کے بھتیجے تھے اور ضمیر نے ان کو بیٹا بنایا تھا۔

تاراجی کربلائے معلیٰ ۱۸۴۳ء

۱۸۴۳ء میں کربلائے معلیٰ (عراق) پر ترک فوجوں کا حملہ ہوا جس میں امام حسینؑ اور جناب عباسؑ کے روضوں کو نقصان پہنچا اور بڑی تعداد میں لوگ قتل ہوئے جن میں لکھنؤ کے زائرین بھی تھے۔ یہ (۱۲۵۸ھ) کا مہینا تھا لیکن لکھنؤ میں اس واقع کی اطلاع اور تفصیلات پہنچتے پہنچتے

۱۲۵۹ھ کا چہلم بھی گزر چکا تھا۔ اس خبر سے شہر، خصوصاً عزاداروں کے حلقے، میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ دبیر، انیس اور دوسروں نے اس پر مرثیے کہے۔ دبیر نے ۲۶ مئی ۱۸۴۳ء کو اپنا مرثیہ ''اے قہر خدا رومیوں کو زیر و زبر کر'' میر باقر سوداگر کے امام باڑے میں پڑھا۔ انیس نے مرثیہ ''اے چرخِ ستمگار یہ کیا جور و جفا'' کہا جس کے کچھ مصرعے حسب ذیل ہیں:

روتے ہیں محبّ شہر میں سامانِ عزا ہے
کرتے ہیں خطوں میں یہ رقم تاجر و زوار
چالیس دن اس شہر کو گھیرے رہے خوں خوار
ذیحجہ کی تھی گیارہویں تاریخ کہ اک بار
درّانہ گھسے توڑ کے سب قلعے کی دیوار
تلواریں علم ہوگئیں اک بار ہزاروں
بے سر ہوئے مظلوم کے زوار ہزاروں
حضرت کی طرف تھا ابھی یہ حشر کہ اک بار
عباس کے روضے میں دھنسی فوج ستمگار
پہ واں مجتہد العصر نظر آئے قضارا
بے جان کئی دیں دار تو گرد اُن کے پڑے تھے
ٹیکے وہ عصا صحن مقدس میں کھڑے تھے
یوں جسم مقدس پہ لگے نیزۂ خوں خوار
کب خوں سے عبا اور قبا ہو گئی گلنار
جس وقت گرا خاک پہ وہ صاحب توقیر
بے دینوں نے سر کاٹ لیا کھینچ کے شمشیر
سنسان ہے اس دن سے مزار شہ عالی

تاراجی کربلائے معلی کے موضوع پر انیس کے اس مرثیے کا جو مخطوطہ اس کی تصنیف کے سال کا ملتا ہے اس کا مقطع ہے:

کرحق سے انیس اب یہ دعا بادل پرغم
یا قادر و یا ناصر و یا خالق اکرم
قائم رہے دنیا میں شہنشاہ معظم
سلطانِ جہاں قبلۂ دیں حامی عالم
دریائے کرم ہے یہ جناب احدی کا
سایہ رہے اس فرق ہمایوں پہ علیؑ کا

ظاہر ہے یہاں ''شہنشاہ معظم'' سے بادشاہ وقت امجد علی شاہ مراد ہیں اور یہ مرثیہ شاہی محل میں پڑھا گیا یا پڑھنے کے لیے کہا گیا تھا۔

ایک مجلس کا چشم دید بیان

۲۷ اپریل ۱۸۴۳ء (۲۶ ربیع الاوّل ۱۲۵۹ھ) کو عظیم آباد کے سیاح نجات حسین خاں نے لکھنؤ میں انیس کی ایک مجلس میں شرکت کی اور اس کا حال اس طرح لکھا:

''۲۶ تاریخ، روز پنج شنبہ، چھ گھڑی دن رہے میں میر ببر علی صاحب انیس تخلص۔''

فرزند عزیز میر مستحسن خلیق کی زبانِ خاص سے مرثیہ سننے کے اشتیاق میں مصطفیٰ خاں کے تعزیہ خانے پہنچا جو میری قیام گاہ سے بہت فاصلے پر ہے۔ مجلس کثیر مجمعے سے بھری ہوئی دیکھی۔ پہلے ایک معمر شخص منبر پر گئے اور فضائل و حدیث پڑھ کر اتر آئے۔ اس کے بعد میاں انیس نے اپنا مرثیہ کمال فصاحت و بلاغت اور نہایت شاعرانہ تکلفات و تناسب کے ساتھ پڑھ کر حاضرین و سامعین کو رلایا اور تحسین و آفرین کے مورد ہوئے۔ ہر شخص کی زبان سے سبحان اللہ اور واہ وا کی صدا بلند ہوئی۔ سچ ہے ان کی تعریف میں جو کچھ بھی کہا جائے اس میں مبالغے کی گنجائش نہیں۔

خاندانی شاعر ہیں۔ شاعر ابن شاعر ابن شاعر ابن شاعر۔ میر ضاحک کے وقت سے جوان کے والد میر خلیق کے والد میر میر حسن کے باپ تھے، سب کے سب شاعر اور مرثیہ گو ہوئے ہیں۔ اس وقت مرزا دبیر کے سوا ان کا کوئی مثل نہیں بلکہ خواص تو انھیں ان پر بھی ترجیح دیتے ہیں۔"

انیس کے حالات میں یہ پہلا چشم دید بیان ہے جو راوی سے براہ راست ہم تک پہنچا ہے۔ اس بیان سے ایک اہم بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء میں انیس کے مدمقابل صرف دبیر سمجھے جاتے تھے۔ اس بات سے کہ خواص انیس کو دبیر پر ترجیح دیتے تھے، انیس کی برتری کا ایک پہلو تو نکلتا ہے اور انیس نے اس بیت میں اس طرف اشارہ بھی کیا ہے:

تعریف کریں خاص تو ہے کام کی تعریف
کہ مانتے ہیں اہل سخن عام کی تعریف

لیکن خواص کی تعداد کم ہوا کرتی ہے اور ظاہر ہے خواص میں بھی بہت ایسے تھے جو انیس کو دبیر پر ترجیح نہیں دیتے تھے، یعنی اس وقت سامعین کی اکثریت دبیر ہی کو بہتر سمجھتی تھی۔ البتہ اب انیس و دبیر کا موازنہ شروع ہو گیا تھا اور مرثیے کے میدان میں یہی دو نام سب سے زیادہ نمایاں تھے۔ حالانکہ اس وقت تک اردو مرثیے کے چاروں ستون خلیق، فصیح، دلگیر اور ضمیر زندہ موجود تھے۔

خلیق کا آخری زمانہ اور وفات ۱۸۴۴ء

اپنے ایک سلام کے مقطعے میں خلیق حیران ہو کر پوچھتے ہیں:

موج زن ہر قطرے میں دریائے خم تھا اے خلیق
جوش پر اب کیوں نہیں طبع رواں کیا ہو گیا

ایک اور سلام کے مطلع میں کہتے ہیں:

مجرائی طبع کند ہے لطف بیاں گیا
دنداں گئے کہ جوہر تیغ زباں گیا

خلیق کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ بڑھاپے کے سبب ان کی طبع کی روانی باقی نہیں رہی اور دانت گر جانے کے سبب وہ مرثیہ ٹھیک سے پڑھ بھی نہیں سکتے اور اب مرثیے کے میدان سے ان کے ہٹ جانے کا وقت آ گیا ہے۔ اس لیے آخر زمانے میں انھوں نے مرثیہ پڑھنا چھوڑ دیا تھا، لیکن اب بھی کبھی کبھی منبر پر جا بیٹھتے تھے۔ پھر ان پر فالج بھی گر گیا۔ اس زمانے میں وہ زیادہ تر انس کے یہاں رہتے تھے جن کی بیوی ان کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ اس زمانے میں بھی وہ مرثیے کے مختلف اجزا پر طبع آزمائی کرتے رہتے تھے۔ ان کا یہ شعر ان کے حسب حال ہے:

لے کر قدِ خمیدہ کو اپنے پھریں کہاں
گوشہ ہی پھر ہے خوب جو زورِ کماں گیا

۲۶ مئی ۱۸۴۴ء (۸ جمادی الاوّل ۱۲۶۰ھ) کو لکھنؤ میں خلیق کی وفات ہوگئی۔ ان کی تدفین عبدالنبی شاہ کے تکیے میں ہوئی۔ یہ تکیہ سٹھٹی سے متصل بھیم کے اکھاڑے میں تھا اور قبرستان اکھاڑا بھیم کے نام سے مشہور تھا۔ اسی قبرستان میں میر تقی میر کی بھی قبر تھی۔ ناصر کی روایت کے مطابق خلیق کے لڑکپن میں میر حسن اصلاح کلام کے لیے ''اول ان کو میر تقی میر کی خدمت میں لے گئے تھے۔ میر نے کہا اپنی ہی اولاد کی تربیت نہیں ہوتی، غیر کی اصلاح کا کسے دماغ ہے۔'' اس طرح خلیق شاعری کے میدان میں ریختے کے اس استاد کا قرب حاصل کرنے سے رہ گئے تھے، لیکن زیرِ زمین ان کو میر کی ہم جواری نصیب ہوئی اور بالائے زمین ان کی آنکھ بھی اسی محلے سٹھٹی میں بند ہوئی جس میں میر کی آنکھ بند ہوئی تھی اور یہ دونوں استاد اس لحاظ سے ہم قسمت بھی تھے کہ ان کے مسکن بھی اور مدفن بھی بے نشان ہو گئے۔

انیس نے اپنے کلام میں کئی جگہ خلیق کی وفات کا ذکر کیا ہے، مثلاً

ہم مر گئے خلیق کے مرنے سے اے انیس — جینے کا لطف اٹھ گیا اس باخدا کے ساتھ

....

ادنیٰ سے ان کے فیض نے اعلیٰ کیا مجھے — ذرہ تھا گو پہ مہر کی بخشی ضیا مجھے

سائے نے ان کے دے دیا ظلِ ہما مجھے　　صدقے سے ان کے مل گئی طبع رسا مجھے
فرزند میں خلیق سے عالی ھِمَم کا ہوں
درِّ یتیم میں اسی بحرِ کرم کا ہوں

یا رب یہ کیسی باغِ جہاں میں ہوا چلی　　لالے کی طرح داغِ دل زار ہیں جلی
آئی صدائے آہ جو چٹکی کوئی کلی　　ہے خارِ رنج سے دل بلبل کو بے کلی
گلچین موت گل کو جو صرف خزاں کرے
کیا عندلیب زمزمہ پرداز یاں کرے

جو سرو راست قد تھے ہوئے خاک میں نہاں　　کوکو کا شور قمریوں میں ہے یہاں وہاں
تیغ اجل گلوں پہ چلی آ گئی خزاں　　اڑتی ہے خاک، خار ہوا گلشنِ جہاں
افسوس ہے خلیق سا مشفق پدر نہیں
اس رنج سے کسی کو کسی کی خبر نہیں

انیس خلیق کے حسنِ زبان کا خاص طور پر ذکر کرتے تھے۔ ان کی یہ رباعی اکثر پڑھتے اور کہتے تھے۔ افسوس مجھ کو باباجان کی زبان نہیں آئی:

عابدؑ جو اٹھا کے رنج و ایذا آئے　　اک شور ہوا کہ شاہ والا آئے
ہمجولیوں سے ہنس کے یہ صغرا نے کہا　　کچھ تم نے سنا؟ ہمارے بابا آئے!

انیس خلیق کے بعد

انیس کا مرثیہ "بہ خدا فارس میدان تہور تھا حر" خلیق کی وفات کے بعد پڑھا گیا تھا جس میں آتش کو انیس نے خود جا کر مدعو کیا تھا۔ اس مجلس میں مونس نے پیش خوانی کی تھی۔ آتش نے بعد مجلس ان کو پوچھا کہ یہ صاحب زادے کون ہیں، بتایا گیا کہ میر خلیق کے چھوٹے بیٹے ہیں تو کہنے لگے:

"کیسی نیک کمائی تھی میر خلیق مرحوم کی۔ ماشاءاللہ زبان ہے کہ آبِ حیات ہے۔"

''بہ خدا فارس......'' ایسا مرثیہ نہ تھا کہ انیس کے پڑھتے ہی اس کی دھوم نہ مچ جاتی۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے مرثیے انیس کا دبدبہ قائم کرنے کے علاوہ یہ ثابت کرنے کے لیے بھی کافی تھے کہ خلیق کی روایت کو انیس نے نہ صرف قائم رکھا ہے بلکہ اسے نیا آب و رنگ دے کر بہت آگے بڑھا دیا ہے۔ اسی لیے آتش نے سید محمد خاں رند سے ایک موقعے پر کہا تھا:

''اس نے تو وہ زبان اختیار کی ہے کہ باپ دادا سے بھی آگے بڑھ گیا۔''

اور انیس کی اس ترقی کا نقصان سب سے زیادہ خلیق کو پہنچا۔ ان کا نام تو (زیادہ تر انیس کے باپ اور پیش رو کی حیثیت سے) باقی رہا لیکن ان کے کلام کی شہرت اور دستیابی کم ہوتی گئی۔ ہوتے ہوتے نوبت اس عام خیال تک پہنچی کہ خلیق کے مرثیے غائب ہو چکے ہیں۔ انیس کا بھی کچھ ایسا ہی خیال تھا اور یہ خیال اپنے بھائی انس سے ان کی رنجش کا ایک سبب بن گیا تھا۔

خلیق کے مرثیوں کا بستہ اور آخر زمانے کا کلام انس کے پاس رہا اور انھوں نے بھائیوں کو اس میں سے کچھ نہ دیا، اس لیے انیس کو گمان رہا کہ انس جو مرثیے اپنے نام سے پڑھتے ہیں وہ زیادہ تر خلیق کے ہوتے ہیں۔ اگر انیس کا گمان صحیح ہوتا تو انس کے مرثیوں کی تعداد اچھی خاصی ہونا چاہیے تھی لیکن ان کے دست یاب مرثیے ایک جلد بھر کے بھی نہیں ہیں اور خلیق کا کلام اگرچہ زیادہ چھپ نہ سکا لیکن اس کے مخطوطے ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ تنہا ادیب مرحوم نے خلیق کے ایک سو ستر مرثیے جمع کر لیے تھے جن کے مختلف نسخوں کی تعداد چار سو تک پہنچ گئی تھی (اس تعداد کو سن کر ایک صاحب نے ادیب سے کہا تھا کہ ''لوگ کیا غلط کہتے ہیں کہ خلیق کا کلام نایاب ہے۔ سارا کلام تو آپ کے پاس ہے۔'')

انس اور انیس کی رنجش خلیق کی وفات کے بعد بڑھ گئی تھی اور لڑانے والوں نے اس رنجش کو اور ہوا دی۔ لیکن جس طرح یہ سمجھنا درست نہ ہوگا کہ دونوں میں وقتی طور پر کچھ نا اتفاقی ہو گئی تھی اسی طرح یہ خیال کرنا بھی صحیح نہ ہوگا کہ دونوں بھائیوں میں مستقل نا اتفاقی رہی۔

لیکن یہ برادرانہ چشمک بہر حال گھریلو تنازعے کی حیثیت رکھتی تھی اور اس معاصرانہ

چشمک کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی جس نے بالآخر اردو کے سب سے بڑے ادبی معرکے کی صورت اختیار کر لی۔

معرکہ انیس و دبیر کا آغاز

شاد لکھتے ہیں:

''ایک بڑی مجلس میں سارے اعیان و شرفائے شہر کا ایک جم غفیر جمع تھا اور بعض با اختیار خواجہ سرا بھی آئے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک خواجہ سرا مرزا دبیر مغفور کے حد سے زیادہ دلدادہ تھے، وہ بھی مجلس میں موجود تھے کہ کسی شخص نے جوش میں آ کر میر انیس کی تعریف میں یہ کلمہ پکار کر کہہ دیا کہ اس کلام کے آگے مرثیہ کہنا بے حیائی ہے۔ مرثیہ گویوں کو اگر شرم ہے تو چاہیے کہ اپنے مرثیے دریا میں ڈال دیں۔ یہ کلمہ خصوصاً اس خواجہ سرا کو تیر کی طرح لگ گیا۔ پیچ و تاب کھایا کیا۔ جب مجلس ختم ہوئی تو اس خواجہ سرا نے اس شخص کا ہاتھ پکڑ لیا اور سخت زبانی کے ساتھ ردو بدل ہونے لگی۔ کچھ لوگ جنبہ کش خواجہ سرا کے اور کچھ طرف دار اس شخص کے ہوئے۔ تا دیر یہی ردو بدل رہی۔ صاحب خانہ نے دونوں کو بہ مشکل اس تکرار سے روکا۔ اس وقت سے اس مخاصمت (معرکہ انیس و دبیر) کی جڑ قائم ہوئی۔''

اس بیان میں زمانے کا تعین نہیں ہے۔ لیکن نجات حسین عظیم آبادی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امجد علی شاہ کے زمانے میں، یا ممکن ہے اس کے بھی کچھ پہلے سے، انیس و دبیر کے تقابل اور ایک پر دوسرے کو ترجیح دینے کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ یہ ضروری نہیں کہ کسی خاص دن کسی خاص واقعے کے بعد یہ معرکہ چھڑ گیا ہو۔

البتہ اس معرکے میں شدت واجد علی شاہ کے زمانے میں اور سنگینی انتزاع کے بعد پیدا ہوئی۔

امجد علی شاہ ہی کے زمانے میں جگراؤں (پنجاب) کے عالم ارسطو جاہ مولوی رجب علی شاہ نے اپنی لکھنؤ آمد پر ایک مجلس کی جس میں انیس نے مرثیہ ''جب نوجواں پسر شہ دیں سے جدا ہوا'' پڑھا۔ یہ انیس کے شاہکار مرثیوں میں ہے اور:

فرما سکے نہ یہ کہ شہ مشرقین ہوں
مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں

اسی مرثیے کی بیت ہے۔ انیس نے یہ مجلس پڑھنے کا کوئی معاوضہ قبول نہیں کیا، شاید اس لیے کہ ارسطو جاہ عارضی طور پر لکھنؤ میں وارد اور شہر کے مہمان کی حیثیت رکھتے تھے۔ غالباً اسی سبب سے ارسطو جاہ کا گھرانا انیس کا شیدائی اور غالی انیسیہ ہو گیا تھا۔

لکھنؤ میں ارسطو جاہ کی صحبت اور اس میں انیس کی بذلہ سنجی کا ایک واقعہ آزاد نے اس طرح بیان کیا ہے:

> ''ارسطو جاہ مولوی رجب علی خاں بہادر حسب الطلب چیف کمشنر بہادر لکھنؤ میں تھے۔ ایک دن بعض عمائدِ شہر موجود، میر انیس بھی تشریف رکھتے تھے۔ کہیں سے آم آئے۔ مولوی صاحب ممدوح نے طاسوں میں پانی بھروا کر رکھوا دیے اور سب مصاحبوں کو متوجہ فرمایا۔ ایک حکیم صاحب اسی جلسے میں حرارت کی شکایت کر رہے تھے مگر شریک چاشنی ہوے۔ کسی بزرگ نے کہا کہ حکیم صاب، آپ تو ابھی علالت کی شکایت فرماتے تھے۔ حکیم جی تو بغلیں جھانکنے لگے۔ میر انیس نے فرمایا: ''فعل الحکیم لا یخلو عن الحکمۃ'' (حکیم کا کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا)۔''

امجد علی شاہ کے زمانے میں علماے دین خصوصاً خاندانِ اجتہاد، یعنی آل غفران مآب مولوی سید دلدار علی کا اثر اور رسوخ بہت بڑھ گیا تھا۔ اس خاندان کے سربراہ غفران مآب کے بڑے بیٹے سلطان العلما مولوی سید محمد تھے۔ سلطان العلما کے بھائی سید العلما مولوی سید حسین

عرف میرن صاحب بھی اس خاندان میں امتیاز رکھتے تھے۔ انیس کے مراسم اس خاندان سے ہو گئے تھے۔ خصوصاً سید العلما کے بیٹے ممتاز العلما سید تقی صاحب سے ان کے بہت قریبی تعلقات تھے۔

خاندان اجتہاد کے علاوہ لکھنؤ میں جو علما اور مجتہد تھے ان میں سب سے اہم اور غیر معمولی شخصیت مفتی میر محمد عباس کی تھی جو مذہبی، علمی ادبی تینوں حیثیتوں سے لکھنؤ کے اکابر کی پہلی صف میں تھے۔ وہ عربی، فارسی، اردو کے شاعر اور انشا پرداز بھی تھے۔ سید تخلص کرتے تھے۔ غالب کے ساتھ بھی ان کے مراسم تھے۔ مفتی صاحب میں حیرت انگیز بے ریائی کے ساتھ حاضر جوابی اور بذلہ سنجی ایسی تھی کہ ان کے بہت سے لطائف مشہور ہیں۔ انیس سے ان کی ملاقاتیں رہتی تھیں اور ان دونوں خوش گفتاروں کے لطفِ صحبت کے بیان ملتے ہیں۔ عزیز لکھنوی لکھتے ہیں:

> ''مفتی صاحب کے اصحاب صحبت میں میر انیس ایک خاص شخص تھے۔ ان سے بے انتہا محبت تھی ان دونوں بزرگوں کی باہمی نشست اور آپس کی باتیں ایسی دلچسپ تھیں جو صفحات تاریخ پر یادگار رہتیں مگر افسوس کہ وہ یکجا نہیں ہو سکتیں۔''

انیس ماہ رمضان میں ایک دن شہر کے علما کی دعوتِ افطار کرتے تھے۔ مولوی صاحب سید جواد دعوت کی تفصیل بیان کر کے بتاتے ہیں:

> ''بعد طعام جو باتیں جناب مفتی صاحب اور میر انیس میں دیر تک ہوئی ہیں ان کی لذت بیان نہیں ہو سکتی۔''

شاہ جی کو مفتی صاحب سے نیاز حاصل تھا، بتاتے ہیں کہ مفتی صاحب کے سامنے انیس کا نام آ جاتا تو ان کی ''یہ حالت ہو جاتی تھی جیسے کسی معشوق کا نام آ گیا۔ باغ باغ ہو گئے۔''

لکھنوی مرثیہ گویوں کے ایک اور خاندان کے سربراہ سید محمد میرزا انس تھے جن کے بیٹے میر عشق، تعشق اور پوتے پیارے صاحب رشید مرثیے کی تاریخ کے معروف نام ہیں۔ عشق کی پہلی شادی ضمیر کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ ربیع الاوّل ۱۲۶۲ھ (فروری ر مارچ ۱۸۴۶ء) میں انس کے

بیٹے سید احمد میرزا صابر کے ساتھ انیس کی دوسری بیٹی مہندی بیگم کی شادی ہوئی۔

گوری رنگت کے تنومند صابر ذی علم جوان تھے۔ انھوں نے فرنگی محل کے عالم مولوی انور علی سے درسیات کی تعلیم لی تھی۔ واجد علی شاہ کے زمانے میں وہ بادشاہ کی ایک بیگم زہرہ محل کے داروغہ ہو گئے تھے۔ یہ صابر کی خوشحالی کا زمانہ تھا۔ انتزاع سلطنت کے بعد ان کا وقت بگڑا۔ انیس اور محمد میرزا انس ان کو کچھ ماہانہ رقم دے دیتے تھے۔ مطالعے کی کثرت سے ان کی آنکھیں کم زور ہو گئی تھیں۔ وہ رات کو تین بجے سے اٹھ کر صبح کے آٹھ بجے تک عبادت اور وظائف میں مشغول رہتے تھے۔ ان ریاضتوں نے تنگ دستی کے ساتھ مل کر صابر کو وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔

مہندی بیگم انیس کی چہیتی بیٹی تھیں۔ مہینے میں دو ایک بار وہ بیٹی کو دیکھنے جاتے اور اپنے سمدھی انس کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ ان صحبتوں میں دلچسپ گفتگوئیں ہوئی تھیں۔ اس کے نواسے باقر صاحب حمید کا بیان ہے کہ ایک دن انس نے یہ شعر پڑھا:

ہمارے سر پہ چھائی ہیں گھٹائیں شام ہجراں کی
وہ اپنے شغل میں ہیں بال اِدھر کھولے اُدھر باندھے

انیس نے سن کر بہت تعریف کی اور اپنے دونوں ہاتھ کانوں کے پاس لے جاکے اور چاروں انگلیوں کو یکے بعد دیگرے ایک دوسری حرکت دے کر دوسرے مصرعے کو اس طریقے سے ادا کیا کہ اب تک وہ تصویر آنکھوں کے سامنے ہے۔"

مہندی بیگم کی سسرال کے کنویں کا پانی بہت عمدہ تھا۔ انیس اپنے بیٹے کے لیے ملازموں کے ذریعے وہاں سے پانی منگواتے تھے۔

....

۱۳ جنوری ۱۸۴۷ء (۲۵ محرم ۱۲۶۳ھ) کو انیس کے قدر دان خواجہ حیدر علی آتش کی وفات ہو گئی۔ انیس کو اس آزادہ رو شاعر کے دلچسپ واقعات معلوم تھے۔ آزاد نے انیس کے

حوالے سے ان کا یہ واقعہ نقل کیا ہے:

''خواجہ صاحب کی سیدھی سادی طبیعت اور بھولی بھالی باتوں کے ذکر میں میر انیس مرحوم نے فرمایا کہ ایک دن آپ کو نماز کا خیال آ گیا۔ کسی شاگرد سے کہا کہ بھئی ہمیں نماز تو سکھاؤ۔ وہ اتفاق سے فرقہ سنت جماعت سے تھا۔ اس نے ویسی ہی نماز سکھادی اور کہا کہ استاد، عبادت الٰہی جتنی پوشیدہ ہو اتنی ہی اچھی ہوتی ہے۔ جب نماز کا وقت ہوتا، یہ حجرے میں جاتے یا گھر کا دروازہ بند کر کے اسی طرح نماز پڑھا کرتے۔ میر دولت علی خلیل ان کے شاگرد خاص اور خلوت وجلوت کے حاضر باش تھے، ایک دن انھوں نے بھی دیکھ لیا، بہت حیران ہوئے۔ یہ نماز پڑھ چکے تو انھوں نے کہا کہ استاد، آپ کا مذہب کیا ہے۔ فرمایا شیعہ، ہیں! یہ کیا پوچھتے ہو؟ انھوں نے کہا، نماز سنیوں کی؟ فرمایا کہ بھئی میں کیا جانوں۔ فلاں شخص سے میں نے کہا۔ اس نے جو سکھادی، سو پڑھتا ہوں۔ مجھے کیا خبر کہ ایک خدا کی دو دو نمازیں ہیں۔''

آتش کا مرنا امجد علی شاہی لکھنؤ کا آخری بڑا ادبی سانحہ تھا۔ اس کے ایک مہینے بعد امجد علی شاہ کی وفات ہوگئی اور اسی دن ۱۳ فروری ۱۸۴۷ء (۲۶ صفر ۱۲۶۳ھ) کو ان کے بیٹے واجد علی شاہ اختر اودھ کے تخت پر بیٹھے۔

☆☆..........☆☆

پانچواں باب

عہد واجد علی شاہ میں

نرم مزاج، فنکارانہ طبیعت اور متنوع شخصیت کے واجد علی شاہ اودھ کے سب سے مقبول حکمران تھے۔ فنون لطیفہ خصوصاً رقص وموسیقی کے شائق ہونے کے علاوہ وہ بڑے دین دار بھی تھے۔ ان کے عہد میں عزاداری کو مزید فروغ ہوا۔ وہ پرنویس مصنف اور پرگوشاہ بھی تھے۔ انھوں نے مرثیے اور سلام بھی بہ کثرت کہے اور ان کے کلام میں دبیر، انیس اور ان کے بھائیوں کا ذکر ملتا ہے مثلاً:

میں کم سنی سے عاشق نظم دبیر ہوں
واللہ لطفِ شعر میں اس کے اسیر ہوں

ع مونس، انیس، سب کا ہوں میں خوشہ چین باغ

جو ذاکر حسینؑ ہے وہ تاجدار ہوا
مونس، انیس، انس، سبھی شہر یار ہوں

واجد علی شاہ تو انیس و دبیر کے قدر دان تھے ہی، اپنی ایک رباعی میں وہ بتاتے ہیں کہ یہ دونوں استاد بھی ان کی قدر کرتے تھے۔

لو اٹھ گئے دنیا سے انیس اور دبیر
افسوس کہ قدر دان اختر نہ رہے

مفتی میر محمد عباس کی مثنوی ''من وسلویٰ'' کی طباعت واجد علی شاہ کی حکومت کے پہلے سال ہوئی۔ مفتی صاحب کی فرمائش پر انیس نے اس کا قطعہ تاریخ کہا جس کے ان دو شعروں میں واجد علی شاہ کا مدحیہ حوالہ دیا:

طبع شد ایں نظم از فضل الٰہ　　　در جلوسِ میمنت مانوس شاہ
خاصۂ درگاہ رب ذوالمنن　　　ظلِ حق واجد علی شاہِ زمن

اس قطعے کے ذکر میں مفتی صاحب بتاتے ہیں کہ '' تارک دنیا انیس اہل دیں'' نے میری مثنوی کی تاریخ کہی۔ یہ انیس کے دنیوی عروج کا زمانہ تھا۔ وہ بہ کثرت مجلس پڑھتے، صلے اور نذرانے قبول کرتے تھے۔ لیکن مفتی صاحب ان کو'' تارک دنیا'' کہہ رہے ہیں، درحالے کہ انیس انھی کی کتاب کے قطعہ تاریخ میں بادشاہ وقت کی مداحی کر کے اپنے تارک دنیا ہونے کی نفی کر رہے ہیں۔

اس معمے کا حل عہد واجدی کے ایک واقعے میں نظر آتا ہے جس میں انیس نے بادشاہ کا تقرب، ملازمت اور خطاب حاصل کرنے کے ایک موقعے کو ہاتھ سے نکل جانے دیا تھا۔ احسن نواب محمد زکی خاں کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ واجد علی شاہ نے شاہنامے کے طرز پر اپنے خاندان کی تاریخ نظم کرانے کی غرض سے جن شاعروں کا انتخاب کیا تھا ان میں انیس بھی تھے اور انیس نے یہ خدمت منظور بھی کر لی تھی۔ وزیر علی نقی خاں نے جب ان کے قیام کے لیے انھیں مصاحب منزل کے کمرے دکھانا شروع کیے تو انیس کو معلوم ہوا کہ ان کو دن رات وہیں رہنا پڑے گا۔ اس سے وہ بے دل ہو گئے۔ ''نواب صاحب ہر کمرا دکھاتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے یہ آپ کو پسند ہے؟ آخر میر انیس نے پریشان ہو کر فرمایا کہ صاحب:

غریبوں کی کیا موت کیا زندگی
جگہ جس جگہ مل گئی مر رہے

آخر میں میر صاحب نے کسی حیلے سے انکار کر دیا۔''

بادشاہ کے دامن دولت سے وابستگی ،اس کی کل وقتی ملازمت ،شاہی مکان میں مستقل سکونت دنیاوی ترقی کی ضمانتیں تھیں۔ ہاتھ آئی ہوئی دنیا سے یوں منھ پھیر لینا حوصلے اور ہمت کا کام تھا۔

مفتی صاحب کا انیس کو''تارکِ دنیا'' کہنا اس واقعے یا اس قسم کے کسی دوسرے واقعے یا واقعات کے باعث ہوسکتا ہے۔

واجد علی شاہ کے یہاں سے ایسے لوگوں کو بھی تنخواہ ملتی تھی جو شاہی ملازم نہیں تھے یا کبھی تھے، اب نہیں تھے۔ یہ بادشاہ کی خاص وضع داری تھی۔ ان کا یہ قول ایک محل پر نقل ہوا ہے:

''میں نے جسے ناراض ہوکر موقوف کیا اس کی تنخواہ بھی بدستور جاری رکھی۔''

شاہی تاریخ لکھنے کے لیے انیس کا تقرر ہوگیا تھا، بعد میں انھوں نے انکار کردیا۔ لیکن بادشاہ کی سرکار سے ان کا سو روپے مہینا مقرر ہوگیا جو بادشاہ کی معزولی کے بعد بھی انھیں کچھ عرصے تک ملتا رہا۔

وزیراعظم نواب علی نقی خان انیس کے مداح تھے۔ ان کی بڑی تمنا تھی کہ انیس ان کے یہاں آئیں۔ لیکن انیس ٹالتے رہے۔ نواب کے ایک مصاحب داروغہ محمد خاں نے یہ تجویز پیش کی کہ نواب اپنی سخت علالت کی خبر مشہور کردیں تو وہ انیس کو عیادت کے واسطے لے آئیں گے۔ چنانچہ نواب صاحب نے اپنے کو بیمار مشہور کردیا۔ داروغہ محمد خاں نے جا کر انیس سے کہا کہ نواب صاحب ہمیشہ آپ کی تشریف آوری کے متمنی رہے۔ اب ان کی علالت میں آپ کا انھیں دیکھنے نہ جانا وضع داری کے خلاف ہوگا۔ انیس نے کہا کہ مجھے چلنے میں عذر نہیں، لیکن کہیں ایسا نہ ہو وہاں میرا مناسب خیر مقدم نہ ہو۔ داروغہ بولے کہ حضور تلوار لے چلیں۔ ذرا بھی خلافِ مزاج بات ہو تو میرا سر قلم کردیں۔ غرض انیس نواب صاحب کے یہاں گئے۔ انھوں نے سروقد تعظیم کی۔ دیر تک باتیں ہوئیں۔ رخصت کے وقت نواب صاحب نے انیس سے مجلس پڑھنے کا وعدہ لے لیا۔ اس دن سے علی نقی کے یہاں ان کی آمدورفت شروع ہوئی۔

رئیسوں کے ساتھ معاملات میں انیس کی نازک مزاجی زیادہ بڑھ جاتی تھی۔ علی نقی خاں کو بھی انیس کی خاطر کا بہت پاس کرنا ہوتا تھا۔ ایک بار انیس کو ان کے یہاں مجلس پڑھنا تھی۔ مجلس شروع ہونے کا وقت آیا تو نواب نے اپنے آدمی کے ذریعے کہلا بھیجا کہ میں اس وقت دردِ سر سے بہت بے چین ہوں۔ حاضری سے معاف رکھا جاؤں۔ انیس نے کہلا دیا آج میرا بھی مزاج درست نہیں ہے۔ مناسب ہے کہ مجلس موقوف رکھی جائے۔ انشاء اللہ آئندہ سال دیکھا جائے گا۔ نواب صاحب گھبرا کر باہر نکل آئے، انیس سے معافی مانگی اور اسی تکلیف میں مجلس کے آخر تک بیٹھے رہے۔

علی نقی خاں کے یہاں بہ قول احسن انیس آٹھویں محرم کی مجلس پڑھتے تھے۔ ایامِ عزا کی یہ تاریخ جناب عباس کے لیے مخصوص ہے۔ ذکرِ عباس انیس کے قلم کو خوب راس آتا تھا۔ ان کے کئی شاہکار مرثیے جناب عباس ہی کے حال میں ہیں۔ اس لحاظ سے علی نقی خان کے یہاں آٹھویں کی مجلسوں کا شمار انیس کی بہترین مجلسوں میں ہونا چاہیے (ثابت ''دربارِ حسین'' میں بتاتے ہیں کہ نواب کے یہاں انیس ساتویں محرم کو پڑھتے تھے۔ ساتویں کو جناب قاسم ابن حسن کا حال پڑھا جاتا ہے)۔

اپنی وزارت کے زمانے میں علی نقی خاں عام طور پر ''نواب صاحب'' کہے جاتے تھے۔ انیس کے اس مقطعے میں ایک نواب کی تعریف کی گئی ہے جو وزیر تھے:

حق سے انیس اب یہ دعا کر بہ انکسار　　　یارب بہ حق شاہ نجف شیر کردگار
شاہوں کی زیبِ تختِ وزیروں کا افتخار　　　قائم رہے جہاں میں یہ نواب نام دار
ہر حال میں عنایتِ مشکل کشا رہے
سر پر ہمیشہ سایۂ دستِ خدا رہے

یہ نواب علی نقی خاں ہو سکتے ہیں۔

حبشی خواجہ سرا دیانت الدولہ واجدی عہد کے سب سے مقتدر لوگوں میں تھے۔ بادشاہ نے ان کو کئی فوجی رسالوں اور توپ خانے کا افسر بنا دیا تھا۔ وہ انگریزی میں بھی گفتگو کر سکتے تھے۔ انیس کے لیے دیانت الدولہ کی بنوائی ہوئی عمارتوں اور امام باڑے کا ذکر آ چکا ہے۔ میر عبدالعلی کا بیان ہے:

''دیانت الدولہ میر انیس کو بہت مانتے تھے۔ ان کی کربلا اور امام باڑے وغیرہ کا انتظام میر انیس کے اختیار میں تھا۔ ان کے یہاں کی مجلسوں میں میں نے میر انیس اور میر مونس کو برف کی قفلیاں تقسیم کرتے دیکھا ہے...... میں نے میر انیس کو دیانت الدولہ کی کربلا میں...... مرثیہ پڑھتے سنا ہے۔''

شیخ امداد علی بحر بھی انیس کے ملاقاتیوں میں تھے اور ان کا بھی وطن فیض آباد تھا۔ کہتے ہیں:

پوچھنا بھی ہے عبث حال خرابی وطن
بحر ہی جب نہ رہے کیا فیض آباد رہے

وہ چاہتے تھے کہ انیس ان کے دیوان کو پڑھ کر اصلاح کر دیں لیکن انیس ٹال دیا کرتے تھے اور ان کے جانے کے بعد کہتے تھے واللہ جو اس شخص کی شاعری میری سمجھ میں آتی ہو۔ پھر بحر کا کوئی شعر پڑھ دیا کرتے تھے، مثلاً

غم سے ہوے ہیں بال ہمارے سفید بحر
سر میں پھپھوندی لگ گئی آنکھوں کی سیل سے

انیس کے ایک شاگرد اپنے کلام میں ایہام وغیرہ سے بہت کام لیتے تھے اور انیس کو ان کا کلام کاٹنا پڑتا تھا۔ ایک دن ان کا سلام دیکھ کر بہت جھلائے اور کہا ''ارے تو تو میرے لیے میاں بحر کا بچہ ہو گیا'' اور یہ خیال نہیں رہا کہ بحر کے ایک شاگرد بیٹھے ہوئے ہیں۔

بحر ناسخ کے شاگرد تھے۔ انیس بتاتے تھے کہ ایک دن میں شیخ ناسخ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ میاں بحر آئے اور اپنا مطلع پڑھا۔ شیخ نے اصلاح دی ''اگلی برسات پہ ساون کی گھٹا ٹل جاتی۔''

بحر اکثر انیس کے پاس آتے اور اپنا کلام سناتے تھے۔ ایک بار انھوں نے اپنا یہ مطلع سنایا جو مشاعرے میں بہت چلا تھا:

حور بن کر ترے کشتے کی قضا آتی ہے
دامن تیغ سے جنت کی ہوا آتی ہے

انیس سن کر چپ رہے۔ جب بحر نے پھر ان سے داد چاہی تو انیس کو غصہ آ گیا اور کہنے لگے، میں نہیں سمجھتا اس مطلعے کی تعریف کیوں کی گئی۔ اس میں ایک غلط ترکیب ''دامنِ تیغ'' استعمال ہوئی ہے۔ اس کی جگہ ''دامنِ شمشیر'' ہونا چاہیے۔ بحر نے ایرانی شاعروں کا کلام بہت چھانا لیکن ''دامن تیغ'' نہیں ملا۔

نظم طباطبائی بحر وغیرہ کی شاعری میں تصنع کا ذکر کر کے لکھتے ہیں:

''لکھنؤ میں ہمیشہ آتش و انیس و نسیم دہلوی کے جرگے والے اس کا مضحکہ کیا کرتے تھے۔''

لیکن یہ بھی لکھتے ہیں:

''ان لوگوں (برق، بحر، وزیر) کا شمار زبانِ اردو کے اساتذہ میں تھا۔ میر انیس سے شاعرِ معجز بیان نے بحر کے ایک شعر پر مصرعے لگائے اور سرِ منبر پڑھے۔''

ان بیانوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انیس بحر کے بے تکے ایہام اور بے لطف خیال بندی کو ناپسند کرتے تھے لیکن یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بحر سے ان کے خاصے مراسم تھے اور وہ اپنے پاس اس ہم وطن شاعر کو کسی حد تک عزیز بھی رکھتے تھے۔

واجد علی شاہ کی تخت نشینی کے پہلے سال انیس کی بیٹی کے یہاں پیارے صاحب رشید کی

ولادت ہوئی جو مشہور مرثیہ نگار اور غزل گو ہوئے۔ ان کے کوئی ایک سال بعد انیس کی بڑی بیٹی عباسی بیگم کے یہاں بھی بیٹے، میر سید علی مانوس کی ولادت ہوئی جو انیس کے بارے میں مستند معلومات کا ماخذ تھے۔

اسی سال استاد مرثیہ گو دلگیر وفات پا گئے۔ اس کے دوسرے سال ۲۰ جون ۱۸۴۹ء (۸ شعبان ۱۲۶۵ھ) کو شاہ نجف کی کارفرما نواب مبارک محل کی وفات ہوئی۔

اب انیس کا کلام لکھنؤ سے باہر بھی پڑھا جا رہا تھا۔ دہلی میں انیس کے مرثیے پڑھنے والوں میں ایک قابلِ ذکر نام محمد حسین آزاد کا ہے۔ ان کے والد مولوی سید محمد باقر اپنے یہاں جو مجلس کرتے تھے اس میں آزاد انیس کے مرثیے پڑھا کرتے تھے۔

نخاس میں سکونت

انیس کے مرثیے ''کوفے میں جب حرم حضرتِ شبیرؑ آئے'' کے مخطوطے کے سرورق پر انیس کو ''ساکنِ شہر لکھنؤ، نخاس بازار'' لکھا گیا ہے۔ یہ مخطوطہ ۱۲۶۷ھ کا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۱ء کے قریب انیس سیدیوں کے احاطے سے منتقل ہو کر اس علاقے میں آ گئے تھے جسے اب پرانا نخاس کہا جاتا ہے۔ یہ چوک کے قریب کا محلہ ہے اور یہیں اکرام اللہ خان کا امام باڑا ہے جہاں انیس نے لکھنؤ کی اپنی پہلی مرثیہ خوانی کی تھی۔

انیس کا مرثیہ ''جس دم یزید شام میں مسند نشیں ہوا'' ۲ فروری ۱۸۵۳ء (۲۲ ربیع الثانی ۱۲۶۹ھ) کو نخاس ہی میں مکمل ہوا۔ اس مرثیے کی تصنیف کے وقت انیس کا رنگ سخن کچھ اس طرح کا تھا:

جس دم یزید شام میں مسند نشیں ہوا　　سب ملک رُوسیاہ کے زیرِ نگیں ہوا
شبیرؑ سے زیادہ اسے بُغض و کیں ہوا　　ایذائے اہل بیت کے درپے لعیں ہوا
کہتا تھا سلطنت کا تو ساماں درست ہے
سختی نہ اِن پہ ہو تو ریاست یہ سُست ہے

خط حاکم مدینہ کو لکھا بہ شدّ ومد　　مضموں یہ تھا کہ تب ہے اطاعت تری سند
بیعت مری حسینؑ سے لے تو بہ جدوکد　　میں فوج بھیجتا ہوں کرے گی تری مدد
بیعت کریں تو جلد ادھر بھیج دیجیو
راضی نہ ہوں تو کاٹ کے سر بھیج دیجیو

....

کرتا تھا سائیں سائیں وہ صحرا سے لق ودق　　تھے بی بیوں کے صُورتِ مہتاب رنگ فق
دم گھٹتے تھے اندھیرے سے بچوں کو تھا قلق　　آواز سے درندوں کی ہوتے تھے سینے شق
مائیں انھیں سلاتی تھیں منھ ڈھانپ ڈھانپ کے
سینوں سے لپٹے جاتے تھے وہ کانپ کانپ کے

اس اثنا میں لکھنؤ کے تیسرے بزرگ مرثیہ گو مرزا جعفر علی فصیح کی بھی وفات ہوگئی۔ ان کی مثنوی ''نان ونمک'' ناتمام رہ گئی تھی۔ اس کی تکمیل کے لیے انیس سے کہا گیا لیکن انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ مجھے تو کوئی ایسا دکھائی نہیں دیتا جو ایسی صفائی اور لطفِ بیان کے ساتھ اس کو پورا کردے۔

مفتی صاحب سے رنجش اور صفائی

۱۸۵۳ء (۱۲۶۹ھ) ہی میں ایک ایسا قضیہ اٹھ کھڑا ہوا جس نے انیس کا مزاج مکدر کر دیا اور انھیں ایک مدت تک مفتی میر عباس کے سے چاہنے والے اور عزیز دوست سے آزردہ رکھا۔

انیس کے چھوٹے بیٹے میر محمد سلیس کی شادی ایک جگہ طے ہوگئی تھی لیکن پھر لڑکی والوں کو ان کے متعلق اچھی اطلاعات نہیں ملیں اور انھوں نے اس کی شادی مفتی صاحب کے بیٹے سید محمد وزیر کے ساتھ طے کر دی۔ مفتی صاحب کو اس معاملے کی خبر ہوئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ میر محمد سلیس اس پر احتجاج کر رہے ہیں۔ مفتی صاحب نے انیس کے شاگرد مرزا محمد زکی علی خاں کو انیس کے پاس بھیج کر کہلایا کہ ان کو پہلے سے اس معاملے کی خبر نہیں تھی۔ انیس نے کہلا دیا کہ مجھ کو کوئی ملال

نہیں ہے۔ البتہ سلیس اور ان کی والدہ کی آزردگی کے خیال سے شادی طے ہونے کی مٹھائی وغیرہ میرے یہاں نہ بھیجئے گا۔ لیکن مفتی صاحب کی لاعلمی میں انیس کے یہاں حصہ بھیج دیا گیا۔ انیس نے حصہ واپس کر دیا۔ ادھر سلیس دیانت الدولہ سے اس معاملے کے فریادی ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ کوئی بات نہیں، ایک پلٹن اور سلیمانی رسالہ وغیرہ لے جا کر دلہن کی فینس تمھارے گھر پہنچ سکتی ہے لیکن جب تک میر صاحب خود میرے نام رقعہ نہ لکھیں گے میں تمھاری مدد نہیں کروں گا۔ سلیس نے میر انیس سے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے خفا ہو کر کہا کہ یہ جبر لانا مجھے منظور نہیں۔ ہزار جگہیں اس سے بہتر موجود ہیں۔ اس قضیے کی شہر والوں کو بھی خبر ہوگئی تھی۔ برات کے دن جا بہ جا مجمع نظر آتا تھا اور فساد کا اندیشہ تھا۔ اسی زمانے میں مفتی صاحب کو ایک خط کے جواب میں اسی خط کے لفافے پر انیس نے یہ شعر لکھ بھیجا:

مرنجاں دلم را کہ ایں مرغ وحشی
زبامے کہ برخاست مشکل نشیند

(میرے دل کو آزردہ نہ کر کہ وحشی پرندہ جس چھت سے اڑ گیا پھر اس پر
مشکل سے بیٹھتا ہے۔)

یہ قطع تعلق کی دھمکی تھی۔ مفتی صاحب نے اسی زمین میں ایک طولانی قطعہ لکھ کر انیس کو بھیجا جس میں ان کو منانے کی بہت کوشش کی، ان سے اپنی محبت کا اظہار کیا اور یہ بھی لکھا کہ سخت حیرت کی بات ہے کہ چند ناقصوں کی وجہ سے آپ کی عقل کامل کے آئینے پر زنگ آ گیا ہے لیکن جب حقیقت عیاں ہوگی تو اس نقش باطل کا نشان بھی نہ رہے گا۔

لیکن انیس پسیجے نہیں۔ انھوں نے مفتی صاحب سے ملاقات ترک رکھی۔ انھوں نے خفا ہو کر مرثیہ پڑھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ مفتی صاحب نے اس پر بھی دو شعر کہے کہ آپ کے بغیر محفل میں سو لوگ بیٹھیں تو بھی نہ کوئی آنسو گرتا ہے نہ شور بکا اٹھتا ہے۔ اس لیے کہ ملکِ شیریں بیانی کے بادشاہ کے بغیر جام کی تہ میں زہر ہلاہل بیٹھ جاتا ہے۔

انیس کے ترک مرثیہ خوانی کی خبر ایسی نہیں تھی کہ شہر میں موضوع گفتگو نہ بن جاتی اور لوگوں میں چہ میگوئیاں نہ ہوتیں کہ انیس نے کیوں مرثیہ پڑھنا چھوڑ دیا۔ چونکہ شادی والا قضیہ مشہور ہو چکا تھا اس لیے لوگوں کا یہ سمجھنا فطری بات تھی کہ انیس کا ترک مرثیہ خوانی اسی کا ردعمل اور مفتی صاحب سے رنجش کا نتیجہ ہے۔ مفتی صاحب کو اس کا احساس ہونا فطری تھا۔ شاید اسی لیے انھوں نے طولانی قطعہ لکھ کر انھیں منانے کی کوشش کی۔

لیکن اس قطعے کے بعد بھی انیس نے مفتی صاحب سے روابط بحال نہیں کیے۔ اس عرصے میں انیس کا امام باڑا تیار ہو گیا (۱۸۵۵ء/۱۲۷۱ھ) مفتی صاحب اس کی زیارت کو گئے۔ انیس نے مفتی صاحب کی مثنوی کی تاریخ ان کی فرمائش پر کہی تھی۔ مفتی صاحب نے از خود امام باڑے کا قطعہ تاریخ پندرہ شعر میں کہا اور اس میں انیس کی مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کی خوب خوب تعریفیں کیں اور یہ بھی لکھا:

نازک دلے کہ ہر چہ بگفتند گوش کرد — امّا نہ حالِ زارِ من ناتواں شنید

نشنید نیم حرف ہم از داستانِ من — از دیگراں اگر چہ دو صد داستاں شنید

(وہ ایسے نازک دل ہیں کہ لوگوں نے ان سے جو کچھ کہا اسے تو سن لیا لیکن مجھ ناتواں کا حالِ زار نہیں سنا۔ میری سرگذشت کا "نیم حرف" بھی نہیں سنا اگر چہ دوسروں کی دو دو سو داستانیں سن لیں) یعنی اس وقت بھی انیس مفتی صاحب سے ترک تعلق کیے ہوئے ہیں۔

مفتی میر عباس کی کوئی معمولی شخصیت نہیں تھی۔ وہ جید عالم دین اور لکھنؤ کے اکابر میں تھے۔ ایسا ممتاز اور خوش اختلاط دوست جو انیس کا مداح اور شیدائی بھی ہو اور ان کو راضی کرنے میں اس قدر کوشاں بھی ہو۔ اس سے اتنی مدت تک بے تعلق رہنا انیس ہی کا کام تھا۔ انیس جتنے بھی نازک مزاج اور شادی کے قضیے سے آزردہ ہوں، یہ ممکن نہ تھا کہ ان کو خود بھی مفتی صاحب سے ترک مراسم کی کوفت نہ ہو۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ مفتی صاحب سے ملنا چھوڑ چکے تھے۔ اتنا ضرور

ہوا کہ انھوں نے مرثیہ نہ پڑھنے کی ضد چھوڑ دی اور مفتی صاحب نے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مصالحت کی طرف ایک اور قدم بڑھا کر انیس کو کشمکش سے بچالیا۔ وہ انیس کی ایک مجلس میں چلے آئے۔ انیس منبر پر بیٹھے تو سامعین میں مفتی صاحب کو دیکھ کر دل بھر آیا۔ علما کی ادب دوستی کا ذکر کیا اور مفتی صاحب کے اشعار بھی پڑھے اور بہت تعریفیں کیں۔ پھر مرثیہ پڑھا۔ مجلس کے بعد مفتی صاحب سے مصافحہ کیا اور مراسم بحال ہو گئے۔

سبحٹی میں سکونت

اس دوران انیس نخاس سے پھر اپنے پرانے محلے سبحٹی میں منتقل ہو گئے جہاں دیانت الدولہ نے ان کے لیے مکان اور امام باڑا بنوادیا تھا۔ یہ عمارتیں شہر کے رئیسانہ مکانوں والے علاقے میں اور اپنے محل و وقوع کے شایان تھیں۔ امام باڑہ اتنے وسیع رقبے کا تھا کہ مکان مسکونہ کا بھی کام دیتا تھا۔ اس امام باڑے کا بننا شہر میں مشہور ہو گیا تھا۔

اس کے بعد سے شاہی کے خاتمے تک انیس سبحٹی کی انہی عمارتوں میں رہے۔

شاہی مجلس: انیس و دبیر کی یکجا خوانندگی (؟)

اس مجلس کا شمار انیس کی زندگی کے اہم واقعوں میں کیا جاتا ہے اور انیس کے ذکر میں اس کا حوالہ بھی بہت دیا جاتا ہے۔ لیکن ہم تک اس کی اتنی روایتیں، وہ بھی تردیدوں کے ساتھ پہنچی ہیں کہ اصل صورت واقعہ کا تعین کرنا تقریباً ناممکن ہو گیا ہے۔ اس روایت کی دستیاب صورتیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ مجلس واجد علی شاہ کے یہاں ہوئی۔

۲۔ مجلس بادشاہ کی والدہ ملکہ کشور کے یہاں ہوئی۔ بادشاہ بھی شریک ہوئے۔

۳۔ وزیر علی نقی کے یہاں الگ الگ مجلسوں میں انیس اور دبیر پڑھے۔ بادشاہ بھی شریک تھے۔

۴۔ دبیر نے بادشاہ کی خواہش کے مطابق پہلے ان کی تعریف میں رباعی پڑھی۔

۵۔ انیس نے بادشاہ کی مرضی کے خلاف مونس کے سلام کا یہ مطلع پڑھا:

غیر کی مدح کریں شہ کے ثنا خواں ہو کر
مجرئی اپنی ہوا کھوئیں سلیماں ہو کر

۶۔ دبیر درباری لباس اور کلاہ پہن کر گئے، انیس نے اس سے انکار کر دیا ور اپنے عام لباس میں مجلس پڑھی۔

۷۔ انیس نے مجلس میں جانے میں جان بوجھ کر دیر لگائی یہاں تک شاہی چوبدار ان کو بلانے کے لیے آیا۔ انھوں نے منبر پر بیٹھ کر مونس سے پوچھا کچھ لائے ہو؟ اور مونس کا دیا ہوا کلام پڑھا۔

شاہی مجلس کے واقعات انیس کے مداحوں کی زبانی بیان ہوئے ہیں۔ انیس کی انانیت، آن بان، وضع داری وغیرہ نے افسانوی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ یہ صفتیں ان میں اعتدال سے زیادہ تھیں، اسی لیے ان کی شخصیت کا ایک انفرادی نقش بن گیا تھا۔ ان کے بالمقابل دبیر کی خاص صفتیں تحمل، صلح پسندی، کسر نفسی وغیرہ تھیں۔ یہ خاموش صفتیں تھیں اسی لیے دبیر کی شخصیت کا کوئی ایسا بولتا ہوا نقش نہیں بنا جیسا انیس کی انوکھی اور کسی حد تک جارحانہ شخصیت کا بنا ہے۔ شاہی مجلس کے واقعات ان کی شخصیت کے اسی نقش کو ابھارنے کے لیے بیان ہوئے ہیں اور اس نقش کو زیادہ اجاگر کرنے کے لیے دبیر کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے گویا ان کا رویہ کچھ گرا ہوا تھا۔ دبیر کے معتقدوں نے بھی یہی سمجھ کر اس رویے بلکہ اس طرح کی کسی مجلس ہی کا انکار کر دیا۔

واجد علی شاہ اور ان کے شاہی حلقے والوں کی طرف سے قیصر باغ میں دھوم دھام کی عزاداری ہوتی تھی لیکن قیصر باغ چوکی پہرے کا علاقہ تھا۔ عام لوگ یہاں کی مجلسوں میں شہر کی دوسری مجلسوں کی طرح شریک نہیں ہو سکتے تھے لیکن یہ مجلسیں لوگوں کی دلچسپی اور قیاس آرائیوں کا موضوع ضرور بن سکتی تھیں۔ ان مجلسوں میں شہر کے نامی مرثیہ خوان بھی پڑھوائے جاتے تھے۔ مجلسیں کرنے والوں میں نواب علی نقی خان بھی تھے اور ان کا ایک مسکن قیصر باغ میں بھی تھا۔

بادشاہ کی مختلف بیگمیں اور والدہ بھی بڑے اہتمام سے مجلسیں کرتی تھیں۔ ان میں سے متعدد مجلسوں اور خود اپنی منعقد کی ہوئی مجلسوں میں بادشاہ بھی شریک ہوتے تھے۔ ظاہراً انھیں مجلسوں میں انھوں نے دبیر کو بھی سنا اور انیس کو بھی۔ روایتوں نے ان مختلف مجلسوں کے واقعات کو خلط ملط کر کے ایک ہی مجلس سے متعلق کر دیا۔ اس مجلس کی روایتوں میں من وعن قبول نہ کرنا چاہیے اس لیے کہ ان روایتوں میں تحریف یا ان کے سیاق وسباق میں تبدیلی ضرور ہوئی ہے اور ان کے بیان کا اصل مقصد انیس کی غیر معمولی شخصیت کو نمایاں کرنا ہے۔

ضمیر کی مجلس سوئم

۱۵ اکتوبر ۱۸۵۵ء (۲۳ محرم ۱۲۷۲ھ) کو میر مظفر حسین ضمیر کی وفات ہوئی اور اسی کے ساتھ اردو مرثیے کے چار ستونوں میں کا آخری ستون بھی گر گیا۔ اپنے بعد کی نسل کے تینوں بڑے مرثیہ گویوں سے ضمیر کا تعلق بنتا تھا۔ دبیر ان کے شاگرد اور میر عشق داماد تھے۔ انیس ان کے معنوی شاگرد بھی تھے اور ان کے سمدھی اور ہم پیشہ خلیق کے فرزند بھی۔ ضمیر کی اہلیہ کی مجلس انیس ہی نے پڑھی تھی۔ خود ضمیر کی مجلس ان تینوں میں سے کوئی بھی پڑھ سکتا تھا۔ افضل حسین ثابت بتاتے ہیں کہ ''یہ مجلس میر انیس کے اصرار سے مرزا دبیر صاحب پڑھے''۔ اور ''دربار حسینؑ'' میں میرزا اوج فرزند دبیر کے حوالے سے اس کا واقعہ بیان کرتے ہیں:

> ''جب میر ضمیر صاحب نے...... انتقال فرمایا تو ان کے سوم کی مجلس میں تمام اہل کمال اور اہل علم کا مجمع تھا۔ برابر برابر یہ تین استاد مرثیہ گو مسلم الثبوت بیٹھے ہوئے تھے، میرزا دبیر، میر انیس، آغا عشق...... اعزہ نے ان تینوں صاحبوں سے کہا کہ اب آپ صاحب جن کو چاہے پڑھوا دیں۔ جناب میر انیس مرحوم نے فرمایا کہ حق تو جناب میرزا صاحب کا ہے، میرزا صاحب پڑھیں۔ میرزا صاحب...... بولے کہ میرا اور آپ کا دونوں کا حق ہے۔ میر صاحب نے فرمایا کہ اچھا یوں بھی سہی تو

آپ کا حق مرجع ہے اور میں عرض کرتا ہوں کہ آپ ہی پڑھیں...... میرزا صاحب...... نے کہا کہ بہتر ہے، میں تعمیل ارشاد کروں گا۔''

اس بیان کا یہ جز محل نظر ہے کہ یہ ساری گفتگو اس وقت ہوئی، جب ضمیر کی مجلس میں لوگ جمع ہو چکے تھے۔ یعنی اس وقت تک یہی طے نہیں ہوا تھا کہ اتنی اہم مجلس کون پڑھے گا۔ یہ گفتگو ضمیر کی تدفین کے موقع کی ہو سکتی ہے اس لیے کہ سویم، پنجم کی مجلس کے وقت، جگہ اور ذاکر وغیرہ کا تعین اور اعلان میت کی تدفین کے بعد قبرستان میں کر دیا جاتا ہے۔

بزرگ مرثیہ نگاروں کی کھیپ کے چاروں استادوں خلیق، دلگیر، فصیح، ضمیر میں خلیق کو چھوڑ کر سب کی وفات واجد علی شاہ کے عہد سلطنت میں ہوئی اور ان کے بعد مرثیے کا میدان انیس اور دبیر کے لیے خالی ہو گیا۔

انیس کی ایک مجلس کا مرقع ۱۲۷۲ھ

احسن انیس کے مدفن کے بیان میں لکھتے ہیں:

''میر انیس مرحوم کی قبر کے سرہانے ایک مجلس کا مرقع بھی لگا ہوا تھا جسے داروغہ محمد خان نے میرے والد مرحوم کے انتظام سے تیار کرایا تھا۔ مرقع عہد شاہی کے فن تصویر کشی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ میر محمد علی صاحب مصور نے بڑی جان کاہی سے کھینچا ہے۔ منبر کے قریب داہنی جانب میرے والد مرحوم کھڑے ہیں۔ میر صاحب کے ہاتھ میں جو مرثیہ ہے اس پر یہ مصرع لکھا ہے:

برہم ہے مرقع چمنستان جہاں کا

داروغہ محمد خان وہی ہیں جنھوں نے انیس کو علی نقی خاں سے ملاقات پر راضی کیا تھا۔ وہ علی نقی خاں کی بھاوج بتولی بیگم کے یہاں داروغہ تھے۔ مرقعے میں جو امکان مجلس دکھایا گیا ہے۔ وہ ڈاکٹر اکبر حیدری کی تحقیق کے مطابق بتولی بیگم ہی کا امام باڑہ ہے جو مفتی گنج میں واقع ہے۔ مرقعے کا بلاک ''روح انیس'' (مرتبہ ادیب) کی طبع اول میں شامل ہے۔ انیس کو جو مرثیہ پڑھتے

دکھایا گیا ہے وہ اس طرح شروع ہوتا ہے:

برہم ہے مرقع چمنستان جہاں کا — ہوتا ہے سفر خلق سے سلطان جہاں کا
سائے میں ہے تیغوں کے بدن جان جہاں کا — جنات میں ماتم ہے سلیمان جہاں کا
مضطر ہیں ملک شورِ تظلّم ہے فلک پر
آہِ دل زہرا سے تلاطم ہے فلک پر

مقطعے کے آخر میں انیس نے دعویٰ کیا ہے کہ اس مرثیے کا ''مضمون کتابی ہے، خیالی نہ سمجھنا'' اور اس سے پہلے کے بندوں میں امام حسینؑ کی پوشاک وغیرہ لٹنے کا حال اس طرح بیان کیا ہے:

جابر نے تو مظلوم کی دستار اٹھالی — لے کر بن اشعث نے عبا دوش پہ ڈالی
لی اسودِ بے رحم نے تیغ شہ عالی — مالک نے زرہ جسم مطہر سے نکالی
دستانے، کٹے ہاتھوں سے غازی کے، اتارے
بے دینوں نے موزے بھی نمازی کے اتارے

تاج سر شاہ شہدا لے گیا کوئی — تیروں سے چھدی تن کی قبا لے گیا کوئی
پیر اہن محبوب خدا لے گیا کوئی — خاتون قیامت کی ردا لے گیا کوئی
عریاں تھا بدن خاک پہ تھی پشت مبارک
خاتم کے لیے کاٹ لی انگشت مبارک

یہ تفصیلات ظاہر ہے کسی کتاب یا کتابوں سے لی گئی ہیں اور اس طرح انیس نے اس اعتراض کا جواب دیا ہے کہ مرثیہ گو تاریخ سے سروکار نہیں رکھتے۔

مجلس کے اس مرقعے پر تاریخ ۱۲۷۲ھ پڑی ہوئی ہے۔

یہ انیس کی زندگی کا اچھا دور تھا۔ وہ ہندوستان کے سب سے بڑے تہذیبی مرکز لکھنؤ کے سب سے ممتاز شہریوں اور یہاں کی سب سے مقبول عزائی صنف مرثیے کے سب سے مشہور

ذاکروں میں تھے۔ شہر کے شان دار علاقے میں رہتے اور رئیسانہ عمارتوں کے مالک تھے۔ اس وقت یہ شہر بڑے بڑے رئیسوں سے چھلک رہا تھا جو عزاداری پر بے دریغ روپیہ صرف کرتے اور انیس کو اپنے یہاں پڑھوانے کے متمنی رہتے تھے، اس لیے مالی اعتبار سے ان کو یہ زمانہ بہت سازگار تھا۔ اس زمانے میں شاہی فوج کے سپاہیوں کی تنخواہ تین چار روپے سے چھے روپے ماہوار تک ہوتی تھی۔ بیس پچیس روپے ماہوار تک کمانے والا اپنے پورے کنبے کی کفالت بہ خوبی کر سکتا تھا۔ انیس کو صرف شاہی مشاہرے اور نجف کے وثیقے سے ایک سو چالیس روپے ماہانہ مل جاتے تھے۔ ان سے بہت زیادہ آمدنی بہ کثرت پڑھی جانے والی مجلسوں کے نذرانوں اور قدردان رئیسوں کے پیش کیے ہوئے ہدیوں اور تحفوں سے ہوتی تھی۔ راجا درگاہ پرشاد مہر سندیلوی اس زمانے میں انیس و دبیر کی مقبولیت اور مالی حیثیت کے ذکر میں لکھتے ہیں:

> ''جس مجلس میں ان صاحبوں کو مرثیہ پڑھنے کا اتفاق ہوتا وہاں سامعین اور شائقین کی کثرت سے چیونٹی کا گزر دشوار ہو جاتا...... صاحب اقتدار امیر، نام وار شہزادے اور عالی خاندان نواب زادے ان دونوں حضرات کے مکانوں پر جمع رہتے اور مناسب خدمات بجالاتے تھے۔ اس صورت میں دونوں کی آمدنی کی رقم ہزاروں تک پہنچ جاتی تھی۔''

انیس کے ملاقاتیوں میں غیر مسلم بھی تھے۔ واجد علی شاہی عہد کے ایک بڑے رئیس راجا کندن لال اشکی اپنی کتاب ''منتخب تنقیح الاخبار'' میں ان اہل کمال کا ذکر کرتے ہیں جن سے انھوں نے ملاقاتیں کیں ان میں انیس کا نام بھی ہے۔ اشکی کے مجمل بیان سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ انیس کی مجلسوں میں بھی شرکت کرتے تھے یا نہیں لیکن میر معصوم علی سوز خواں، جو خود بھی انیس کی مجلسیں سنتے تھے، بتاتے ہیں کہ انیس کی مجلسوں میں ہندو سامعین بھی ہوتے تھے۔ منشی نول کشور کے بارے میں یہ بیان ملتا ہے کہ وہ انیس کی مجلسوں میں ہی شریک ہوتے تھے۔ انیس کے ایک سلام کے یہ شعر اسی زمانے پر صادق آتے ہیں:

کنج عزلت میں مثال آسیا ہوں گوشہ گیر
رزق پہنچاتا ہے گھر بیٹھے خدا میرے لیے
آبرو ومال و فرزندانِ صالح عز و جاہ
کس کی خاطر یہ ہوا جو کچھ ہوا میرے لیے
بھر دیا دامن کو مولا نے دُرِ مقصود سے
زر دیا زر پر عطا پر کی عطا میرے لیے

انیس کے بیٹوں خصوصاً نفیس نے شاعری کا خاندانی ورثہ پایا تھا۔ اس لحاظ سے انیس فرزندانِ صالح کے باپ تھے اور یہ ان کی بڑی خوش نصیبی تھی کہ مرثیہ گوئی جوان کا ذریعہ معاش تھی وہی ان کی عزت وآبرو اور اعلیٰ دنیاوی مرتبے کا بھی ذریعہ تھی اور ان کو یقین تھا کہ یہی مرثیہ گوئی ذکرِ رسولؐ اور آل رسولؐ کی مداحی کے طفیل آخرت میں بھی ان کے مدارج بلند کرے گی۔ ایک بڑی آسودہ خاطری یہ بھی تھی کہ ان کو اپنے کلام کے بہترین سامعین اپنے شہر لکھنؤ ہی میں دست یاب تھے۔ اس شہر کی آنکھوں کے سامنے یہ نئے انداز کا مرثیہ پروان چڑھا اور اس کا اداشناس لکھنؤ سے زیادہ کوئی شہر نہیں تھا۔ یہاں انیس کو اپنے ہر مصرعے کی ہر صفت کی داد مل سکتی تھی۔ اسی لیے انھوں نے ایک مقطعے میں یوں دعا کی تھی:

بس انیس اب یہ دعا مانگ، اے رب عباد
لکھنؤ کے طبقے کو تو سدا رکھ آباد

رونے والے شہ والا کے رہیں خلق میں شاد
ان کے سائے میں برومند ہو ان کی اولاد
عشرۂ ماہِ عزا نالہ کشی میں گزرے
سال بھر شہ کے غلاموں کو خوشی میں گزرے

اور ایک مقطعے میں دعا کی تھی:

آباد لکھنؤ رہے تا حشر یا الٰہ
رکھ میرے دوستوں کو جہاں میں بہ عزّ و جاہ
یارب ہرا بھرا چمنِ آرزو رہے
جب تک چمن میں گُل رہے اور گُل میں بُو رہے

لیکن انیس کی مجلس کے مرقعے کی یہ تحریر کچھ اور ہی پیشین گوئی کر رہی تھی:

''برہم ہے مرقع چمنستان جہاں کا ۱۲۷۲ھ''

یہ ۱۲۷۲ھ انتزاعِ سلطنت اودھ کا سال تھا۔

☆☆..........☆☆

چھٹا باب

انتزاعِ سلطنتِ اَودھ ۱۸۵۶ء

آشوب ۱۸۵۷ء

سلطنت اودھ کے خاتمے کے ساتھ لکھنؤ کی بربادی کا دور شروع ہوا۔ سوا دو سال کے عرصے میں لکھنؤ اس انقلاب کے کئی مرحلوں سے گزرا اور ہر مرحلہ اس کے لیے تباہ کن رہا۔ یہ مرحلے حسب ذیل ہیں:

۱۔ انتزاع سلطنت اور انگریزی بندوبست۔ قریب ڈیڑھ سال تک

۲۔ ہندوستانی فوجوں کا انحراف اور آزادی کی جدوجہد۔ قریب دو مہینے تک

۳۔ دوبارہ آزادی اور برجیس قدر کی حکومت۔ آٹھ مہینے تک۔ اس دوران خون ریز جنگ بھی ہوتی رہی۔

۴۔ ''بھگدڑ''۔ ہندوستانی فوجوں کی شکست۔ اہل شہر کا لکھنؤ سے فرار، قتل وغارت

۵۔ ''تسلط''۔ شہر پر انگریزوں کا مکمل قبضہ۔ امن کی منادی۔ شہریوں کی واپسی

۶۔ ''انہدام''۔ شہر کی عمارتوں کی کھدائی

ان مرحلوں کی روداد اس طرح ہے:

۴ فروری ۱۸۵۶ء (۲۹ جمادی الاول ۱۲۷۲ھ) کو انگریزوں نے واجد علی شاہ کی معزولی اور اودھ پر اپنے قبضے کا اشتہار جاری کر دیا۔ واجد علی شاہ اپنا مقدمہ برطانوی پارلیمنٹ میں پیش کرنے کے لیے لندن جانے کے ارادے سے لکھنؤ سے روانہ ہوئے جہاں پھر انھیں آنا نصیب نہیں ہوا۔ کلکتہ پہنچ کر ان کو مٹیا برج کا قیام اختیار کرنا پڑا اور ان کی زندگی کے بقیہ اکتیس

سال وہیں گزرے۔

لکھنؤ میں انگریزوں نے اپنا بندوبست شروع کر دیا اور اودھ پر قبضہ کرنے میں ان کو مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا، لیکن فضا میں اندر اندر ایک بے چینی سی تھی اور وہ خود بھی محسوس کر رہے تھے کہ عوام نے حکومت کی تبدیلی کو قبول نہیں کیا ہے۔

اسی فضا میں محرم (۱۲۷۳ھ) کا زمانہ آ پہنچا۔ یہ لکھنؤ میں بڑے اجتماعوں اور عوامی جلوسوں کا زمانہ ہوتا تھا۔ جابر حکومت کے خلاف امام حسینؑ کا جہاد ذہنوں پر چھایا رہتا تھا۔ انگریزوں کو محرّم سے خطرہ محسوس ہوا۔ انھوں نے شہر میں جا بہ جا پہرے بٹھا دیے اور کئی امتناعی حکم جاری کیے جن کے نتیجے میں بڑی مجلسیں موقوف رہیں۔ زیادہ تر گھروں کے اندر زنان خانوں میں چھوٹی چھوٹی مجلسیں کر لی گئیں۔ بیچ بیچ میں یہ خبریں بھی گشت کرتی رہیں کہ عزاداری کے پردے میں اندر اندر کوئی بڑا ہنگامہ پرورش پا رہا ہے۔ شب عاشور درگاہ حضرت عباس میں بہت مجمع ہو جایا کرتا تھا۔ حکومت کی طرف سے یہ بندوبست کیا گیا کہ عزاداروں کا ایک ایک جتھا درگاہ میں آ کر ماتم کرے اور اس کے نکل جانے کے بعد دوسرا جتھا آئے۔ اس کے باوجود ایک بار بہت سے لوگوں نے ایک ساتھ زبردستی درگاہ میں داخل ہونا چاہا اور ان کو سنگینوں کے زور پر روکا گیا۔ روزِ عاشور کے لیے حکم ہوا کہ سارے شہر کے تعزیے لکھنؤ کی مختلف کربلاؤں کے بجائے صرف میر خدا بخش کی کربلا میں دفن کیے جائیں۔

اس طرح انگریزی حکومت کا یہ پہلا محرّم بے رونق گزر گیا۔ اس سے یہ گمان پیدا ہونا فطری بات تھی کہ انگریزی حکومت میں عزاداری کا قائم رہنا مشکل ہے۔ اس کے بعد والے سال کا محرم جنگی حالات کی نذر رہا اور جنگ انگریزوں کی فتح پر ختم ہوئی اور یہ خیال عام ہو گیا کہ لکھنؤ میں قومی حکومت کے ساتھ عزاداری کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ مونس کے ایک سلام کا یہ مقطع اسی مایوسی کا اظہار کرتا ہے:

غم ہمیں اپنی تباہی کا نہیں اے مونس
ہے یہ صدمہ کہ عزادارئ شبیرؑ گئی

شاہی کارخانے کی معطلی نے بہت بڑی تعداد میں سرکاری ملازموں کی معاش کا خاتمہ کر دیا۔ پھر بادشاہ کے متوسل رئیسوں کی ڈیوڑھیاں اجڑ گئیں۔ ان سب کے ملازموں، کارندوں اور ان کے بھی ملازموں کی نوکریاں ختم ہوگئیں۔ اس کے نتیجے میں اہل حرفہ، تجاّر اور دوسرے صنعت گروں کا کاروبار بھی معطل ہو گیا۔ اودھ کی معیشت پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا اور اس خوش حال صوبے کی دولت لندن پہنچنے لگی۔ اس طرح انگریزی عمل داری کے تھوڑے ہی دنوں کے اندر لکھنؤ میں نئی حکومت سے بددل اور آشفتہ روزگار لوگوں کا ایک لشکر تیار ہو گیا اور ان میں بہتوں کی نوبت فاقہ کشی کو پہنچ رہی تھی۔

اس عرصے میں یہ خبر پھیل گئی کہ انگریزی فوج کے نئے کارتوسوں میں سور اور گائے کی چربی لگائی گئی ہے۔ ان کارتوسوں کو استعمال کرنے کے لیے اُن کا ایک حصہ دانت سے کاٹنا پڑتا تھا۔ انگریزی فوج کے ہندوستانی سپاہیوں کو یقین ہو گیا کہ یہ ان کے مذہب کو ختم کرنے کی انگریزی سازش ہے۔ اس پر احتجاج اور برہمی کی آگ پھیلنا شروع ہوئی جس کی لپٹیں لکھنؤ میں بھی پہنچیں اور اہلِ شہر کو اس آگ میں امید کی روشنی نظر آنے لگی۔ واجد علی شاہ کی ایک بیگم نواب فرخندہ محل نے لکھنؤ سے بادشاہ کے نام مئی ۱۸۵۷ء (رمضان ۱۲۷۳ھ) کے ایک خط میں لکھا:

> ''دوسری یہ ایسی تازہ ایک روداد ہوئی کہ جس سے طبیعت کچھ کچھ شاد ہوئی کہ آٹھویں کو اس مہینے (رمضان) کی، روز یک شنبہ (۳ مئی) دوپہر سے فوج انگریزی تقسیم پر کارتوسوں کی بگڑ گئی۔ جنگ و جدل کی ٹھہر گئی۔ سب فوج موسیٰ باغ میں عیسائیوں کے قتل کو یک جا ہوئی۔ وقتِ تحریر تک وہی مجمع کثیر ہے۔''

انگریزوں کی طرف سے منحرف سپاہیوں کو سمجھانے بجھانے، ڈرانے دھمکانے کی کارروائیاں ہو رہی تھیں کہ میرٹھ اور دہلی میں انگریزوں پر ہندوستانیوں کے غلبے کی خبریں پہنچنے لگیں۔ اس سے لکھنؤ میں ایک جوش پیدا ہوا اور انگریزوں کو یہاں بھی جنگ کے آثار نظر آنے

لگے۔ انھوں نے اپنے مستقر رزیڈنسی اور مچھی بون کی قلعہ بندی کی اوران اطراف میں اپنے فوجی دستوں اور گاڑیوں وغیرہ کی آزادانہ نقل وحرکت کے لیے ''غربائے شہر کے جتنے مکانات زیر قلعہ (مچھی بھون) تھے، سب کومسمار کیا۔'' یہ شہر کی عمارتوں کے انہدام کی ابتدا تھی پھر چیف کمشنر نے رزیڈنسی کے ہر طرف توپیں نصب کیں اور ''دورتک جتنے مکان سامنے تھے، سب کو مسمار کیا''۔ بھیم کا اکھاڑا، سٹھبٹی وغیرہ اسی علاقے میں پڑتے تھے۔ ان محلوں کے زیادہ تر رہنے والے شہری نسبتاً محفوظ علاقوں میں منتقل ہونے لگے۔

اب انگریزی اور ہندوستانی فوجوں میں کھل کر تصادم شروع ہوگیا۔ اس میں عام لوگ بھی ہندوستانی سپاہیوں کے ساتھ شریک ہو گئے اور ایک مہینے تک شہر میں عجب شورش برپا رہی۔ ہندوستانیوں نے موقع پاکر انگریزوں کو قتل کیا۔ انگریزوں نے بھی بڑی تعداد میں ہندوستانیوں کو پھانسیاں دیں، لیکن اب وہ کچھ بے بس سے نظر آرہے تھے۔ اودھ کے دوسرے علاقوں کے منحرف سپاہیوں نے ایک بڑی فوج کی ہیئت اختیار کر کے لکھنؤ کا رخ کیا۔ ۳۰ جون ۱۸۵۷ء (۷ ذیقعد ۱۲۷۳ھ) کو یہ فوج لکھنؤ میں داخل ہوگئی۔ اودھ کے تعلقدار، زمین دار اور راجا بھی اپنے اپنے ہتھیار بند جتھوں کے ساتھ لکھنؤ کو آزاد کرانے کے لیے شہر میں چلے آرہے تھے۔ انگریز ان کی مزاحمت نہ کر سکے۔ قلعہ مچھی بھون کو جہاں انگریزوں نے گولا بارود، ہتھیاروں اور غلے کے ذخیرے جمع کر رکھے تھے، ہاتھ سے جاتا دیکھ کر انھوں نے خود ہی بارود لگا کر اڑا دیا اور خود بیلی گارد (رزیڈنسی) میں سمٹ آئے۔ ہندوستانیوں نے اس کا محاصرہ کر لیا اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ انگریزی حکومت کا خاتمہ قریب آپہنچا، بلکہ ہو ہی گیا۔ اس وقت ہندوستانیوں نے پھر سے اودھ کی بادشاہی قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور واجد علی شاہ کی بیگم حضرت محل کی سربراہی میں ان کے کم سن بیٹے برجیس قدر کو بادشاہ بنا دیا گیا۔ بیلی گارد کے محاصرے اور اس پر حملوں میں اور بھی شدت پیدا ہوگئی۔ لیکن اسی کے ساتھ خاص شہر میں بھی بدامنی کے واقعات بڑھنے لگے۔ بہت سے شہریوں پر انگریزوں کی درپردہ حمایت اور مخبری کے شبے میں سختیاں کی گئیں۔ نئی حکومت کو جنگ

کے اخراجات پورے کرنے کے لیے روپے کی سخت ضرورت لاحق ہوئی اور اودھ کے سابق وزیر منورالدولہ احمد علی خان، دلیرالدولہ میرزا حیدر کے خاندان دوسرے امیروں اور اودھ کی بیگموں کو مطالبہ زر کے سلسلے میں پریشان کیا گیا اور لڑائی میں شدت پیدا ہونے کے ساتھ شہر میں لوٹ مار کے واقعات بھی بڑھنے لگے۔ نتیجے میں بہت سے لوگ برجیس قدر کی بادشاہی اور ہندوستانی فوج سے بیزار ہوکر انگریزوں کی فتح کے خواہش مند ہو گئے اور بعض نے عملاً ان کی مدد بھی کی۔

اب لڑائی کا پانسا پلٹا۔ ۲۲ ستمبر ۱۸۵۷ء (۳ صفر ۱۲۷۴ھ) کو ایک بڑی انگریزی فوج اس کے بعد ۱۴ نومبر ۱۸۵۷ء (۲۵ ربیع الاول ۱۲۷۴ھ) کو انگریز کمانڈر انچیف قریب ایک لاکھ کی فوج کے ساتھ لکھنؤ میں داخل ہوا۔ قیصر باغ پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا اور بیگم حضرت محل وغیرہ نے اسے خالی کر دیا۔ ''فرارِ فوج اور فرارِ عام'' اس پرآشوب دور کا وہ مرحلہ تھا جسے ''بھگدڑ'' کا نام دیا گیا۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ انگریزوں نے شہر کے اندر بے محابا گولا باری شروع کر دی جس کا مقصد ہی یہ تھا کہ ہندوستانی فوج کے ساتھ رعایا بھی شہر کا تخلیہ کر دے۔ اس زمانے میں ایک طرف اہل شہر اپنے مسکن چھوڑ چھوڑ کر بھاگ رہے تھے، دوسری طرف تلنگوں وغیرہ کی ہندوستانی فوج بھاگتے میں لوٹ مار کر رہی تھی، تیسری طرف مولوی احمد اللہ اپنی مختصر فوج کے ساتھ انگریزوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ ان معرکوں میں انگریزی فوج شہر کے مغربی محلوں چوک، فرنگی محل، نخاس، منصور نگر، کاظمین، درگاہ حضرت عباسؓ، سعادت گنج تک پھیل گئی۔ احمد اللہ شاہ بھی شہر خالی کر گئے۔ انگریزی فوج کے ''بزن'' (قاتل دستے) شہر کے ایک طرف سے آتے اور راستے میں پڑنے والے ہر آدمی بلکہ کتوں تک کو ہلاک کرتے ہوئے دوسری طرف نکل جاتے۔ اہل شہر اپنا مال و دولت گھروں میں دفن کر کے یا کنوؤں میں چھپا کر شہر کے واحد کھلے ہوئے ناکے سے باہر بھاگ رہے تھے۔ ان گھروں میں سپاہی گھستے، بچے کھچے مکینوں کو قتل کرتے اور فرش وغیرہ کھود کر یا کنوؤں میں ڈھونڈھ کر چھپایا ہوا مال نکال لے جاتے۔ کمال الدین حیدر لکھتے ہیں:

''خلاصہ، رعایا سے بے گناہ پر ہر طرح آفت ہے...... آخر سب نے......

بے اسباب مال وزر مثل مور وملخ جانب مغرب ناکہ شہر کاکوری...... کی راہ لی...... وہ دن، وہ رات کچھ قیامت سے کم نہ تھی...... گلیوں سے کتے شہر کے معلوم نہیں کہاں چھپ رہے تھے۔ کوئی پرندہ آسمان پر نظر نہ آتا تھا۔ ہر کوچے سے وحشت برستی تھی اور خون ناحق کی بو آتی تھی۔''

لکھنؤ کے بیشتر مفرورین کو قریبی قصبوں کے رئیسوں نے اپنے باغوں میں پناہ دی لیکن لکھنؤ میں رہ جانے والی رعیت کا قتل عام ہوتا رہا۔

آخر ۲۱ مارچ ۱۸۵۸ء (۴ شعبان ۱۲۷۴ھ) کو لکھنؤ میں امن کی منادی کے ساتھ قتل عام موقوف ہوا۔ اعلان کیا گیا کہ شہر سے بھاگے ہوئے لوگ ۱۹ اپریل تک اپنے گھروں میں واپس آجائیں۔ ''جو نہ آئے گا اس کا گھر ضبط ہو کر نیلام ہو جائے گا۔'' پھر اس مدت میں کچھ توسیع کی گئی رفتہ رفتہ مفرورین اپنے گھروں کو واپس آنے لگے مگر اس کے بعد بھی کثیر تعداد میں ان لوگوں کو جو انگریزوں کی نظر میں بغاوت کے مجرم تھے۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر پھانسیوں پر لٹکایا جاتا رہا اور بہت دن تک لکھنؤ اور اطراف کے درختوں پر لاشیں جھولتی نظر آتی رہیں۔

اس کے بعد شہر کی کھدائی ورعمارتوں کے انہدام کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ بیان بہت جگہ ملتا ہے کہ تین چوتھائی شہر کھود دیا گیا آدھا شہر انتقامی تخریب کا شکار ہوا اور چوتھائی ان سڑکوں میں آ گیا جو شہر میں جا بہ جا نکالی گئی تھیں

☆☆............☆☆

ساتواں باب

آشوب اور انیس

آشوب کے دنوں کا ایک واقعہ شیخ محمد جان شاد پیرِ ومیر کی زبانی بیان ہوا ہے کہ جس زمانے میں ہندوستانی سپاہی بیلی گارد کا محاصرہ کیے ہوئے تھے، ایک دن شاد اپنے مکان سے قیصر باغ کی طرف جارہے تھے۔ راستے میں ایک بھنگی نے ان کو اس طرف جانے سے منع کیا اور بتایا کہ انگریزوں کی کمک کے لیے فوج آگئی ہے اور انگریز کمانڈر بھی اپنے لشکر کے ساتھ آیا چاہتا ہے۔ پھر انیس کی یہ بیت پڑھی:

لاکھوں میں کوئی قبل کوئی بعد آئے گا
گیتی ہلے گی جب عمرِ سعد آئے گا

یہ وہ زمانہ تھا جب سبٹی اور آس پاس کا علاقہ محاذ جنگ بنا ہوا تھا اور اس علاقے کے شہری وہاں سے ہٹ گئے تھے۔ ان شہروں میں انیس بھی تھے۔ وہ سبٹی کی سکونت ترک کر کے اپنے شاگرد مرزا محمد عباس کے مکان واقع منصور نگر میں اٹھ آئے تھے۔ بھگدڑ یا فرار عام کے زمانے میں وہ کاکوری کے ایک باغ میں مقیم رہے۔ منادی امن کے بعد پھر منصور نگر واپس آئے۔

اس آشوب میں اہل شہر پر طرح طرح کے حادثے گزرے۔ ہمیں تین ایسے حادثوں کا سراغ ملتا ہے جن کا تعلق انیس اور ان کے اہل خاندان سے ہے۔

انیس کی عمارتوں کا انہدام اور زمین کی ضبطی

شہر کی فتح اور کھدائی کی مہم سے پہلے ہی انگریزوں نے سبٹی کے علاقے کی بہت سی عمارتیں گرادی تھیں۔ انیس کا امام باڑہ اور مکان بھی سبٹی میں تھے اور انھیں بھی منہدم کر دیا گیا۔

مونس نے جو اس وقت تک انیس ہی کے ساتھ رہتے تھے، واجد علی شاہ کے نام اپنی ایک منظوم عرضی میں یہ شعر بھی لکھا تھا:

ہوا گھر بھی ، عزا خانہ بھی برباد
رہی باقی محلے کی نہ بنیاد

تسلط کے بعد انگریزوں نے شہر کی بہت سی عمارتوں اور منہدم شدہ عمارتوں کی زمینوں کو بہ حق سرکار ضبط کر لیا جن کی واپسی کے لیے صاحب املاک کو سرکار میں یہ ثابت کرنا ہوتا تھا کہ اس نے انگریزوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی تھی۔ اس میں بہتوں کو ناکامی ہوئی۔ انیس کو بھی ان کی گئی ہوئی املاک واپس نہیں ملی۔ انھوں نے اس کی واپسی کا مطالبہ ہی نہیں کیا، غالباً اس لیے کہ یہ املاک دیانت الدولہ کی دی ہوئی تھیں جو معزول بادشاہ کے خاص الخاص آدمی تھے اور انھی کے ساتھ کلکتے چلے گئے تھے۔

املاک سے انیس کی دست برداری کے ایک قوی تر سبب کا اشارہ ان کے چھوٹے بیٹے میر محمد سلیس کی ایک فریادی منقبت سے ملتا ہے۔

فرزند انیس کا قید ہونا

شاعروں خصوصاً مرثیہ گویوں کا قاعدہ تھا کہ جب ان پر کوئی مصیبت پڑتی تو حضرت علی کو جن کا ایک مشہور لقب ''مولا مشکل کشا'' ہے، خطاب کر کے منظوم فریاد کرتے اور اس میں اپنی مصیبت کا ذکر اور ان سے مدد کی التجا کرتے۔ انیس کی منقبت ''اب مدد کیجیے دم امداد ہے یا امیر المومنین فریاد ہے'' کا حوالہ دیا جا چکا ہے۔ سلیس کی فریادی منقبت کی ترجیح کا شعر ہے:

میں کس سے حال دل اپنا کہوں سوائے خدا
مدد کو پہنچو مری یا علی برائے خدا

اس کے یہ مصرعے قابل غور ہیں:

مدد کرو کہ اس آفت سے اب بچائے خدا　　جفا کی قید سے جلدی کہیں چھڑائے خدا
ٹھکانا بیٹھنے کے واسطے نہیں ملتا　　وطن بھی چھوٹ گیا گھر لٹ گیا، تباہ ہوا
ع　　اور اس پہ آہ یہ رنج ومحن اسیری کا

کیے ہیں یوں تو ہزاروں گناہ یا حضرت
پہ جس قصور کی دشمن نے مجھ پہ کی تہمت
خدا گواہ کہ اس میں نہیں مری شرکت

قصور جو کہ ہوا ہے وہ بخشوادیجیے
شتاب قید سے اب آن کر چھڑا دیجیے
سلیس خستہ کو مقصد سے اب لگا دیجیے

سلیس کا اپنا مکان نہیں تھا۔ وہ انیس ہی کے مکان میں رہتے تھے۔ منقبت میں وہ بتاتے ہیں کہ دشمنوں کی وجہ سے وہ بے گھر ہو گئے ہیں۔ ان کا یعنی انیس کا مکان لوٹ لیا اور تباہ کر دیا گیا ہے۔ ان کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا ہے اور وہ کسی دوسرے مقام پر قید ہیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ ایک طرف وہ خدا کو گواہ اور حضرت علیؑ کو خطاب کر کے کہتے ہیں کہ مجھ پر دشمنوں نے جس قصور کی تہمت لگائی ہے، میں اس میں شریک نہیں تھا، دوسری طرف یہ التجا کرتے ہیں کہ مجھ سے جو قصور ہوا ہے اسے معاف کرا دیجیے۔

تسلط کے بعد انگریزوں نے دارو گیر کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ مخبروں کے ذریعے پتا لگا کر اور دوسرے ذریعوں سے تفتیش کر کے جن لوگوں کو تحریک میں ملوث پایا تھا ان کو سزائیں دیں۔ بہت لوگ ایسے تھے جنھوں نے مواخذے کے خوف سے لکھنؤ چھوڑ دیا۔ ان میں بھی بہت سے جہاں پہنچے تھے وہیں پکڑ لیے گئے۔ سلیس کے ساتھ ظاہراً یہی صورت پیش آئی۔ خود کو بے قصور بھی کہنے اور قصوروار بھی ماننے کا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ سلیس پر جس جرم کے ارتکاب کا الزام تھا اس میں

وہ براہ راست شریک نہیں تھے لیکن جرم کے مرتکب فریق یا واردات سے یکسر بے تعلق بھی نہیں تھے اور یہی ان کا قصور تھا۔ اسی اندیشے کے تحت وہ لکھنؤ سے باہر تھے اور وہیں قید کر لیے گئے۔ ملزم سلیس کے باپ کی حیثیت سے انیس کو اپنی املاک کے باب میں خاموش ہی رہنا تھا۔

اولاد کا خطرے میں پڑ جانا انیس کے لیے املاک کے زیاں سے زیادہ سخت حادثہ تھا، لیکن اس زمانے کا تیسرا حادثہ اس سے بھی زیادہ سخت تھا۔

بیٹی کی وفات

بھگدڑ کے زمانے میں لکھنؤ کے شہری افراتفری کے عالم میں اپنے اپنے مکان چھوڑ کر نکلے تھے۔ اس وقت لوٹ مار بھی ہو رہی تھی اس لیے زیادہ تر مکین اپنا قیمتی سامان مکان ہی میں چھپا گئے تھے۔ یہ لوگ ظاہر ہے مال چھپانے کے ماہر نہیں تھے لیکن لوٹنے والے چھپایا ہوا مال ڈھونڈ نکالنے میں مشاق تھے، یا ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے مشاق ہو گئے تھے۔ اس لیے منادی امن کے بعد شہر واپس آنے والوں میں کم ایسے تھے جن کو اپنا چھپایا ہوا مال صحیح سلامت ملا ہو۔ مختلف تحریروں میں ایسے بہت لوگوں کا ذکر ملتا ہے جن کا مال اس طرح لُٹ گیا۔ ان میں انیس کی بڑی بیٹی عباسی بیگم بھی تھیں۔ انھوں نے اپنا مال مکان کے صحن میں دفن کرا دیا تھا اور انیس کے کنبے کے ساتھ شہر سے چلی گئی تھیں۔ واپس آئیں تو دیکھا لٹیرے سارا مال کھود کر نکال لے گئے ہیں۔ اس کا اُنھیں ایسا صدمہ ہوا کہ خفقان میں مبتلا ہو گئیں، پیٹ میں پھوڑا بن گیا اور اسی میں وفات پا گئیں۔

عباسی بیگم کے بیٹے میر سید علی مانوس اس وقت نو دس برس کے تھے۔ انھیں انیس نے اپنے ساتھ رکھا۔ ان کی شادی نفیس کی بیٹی سے ہوئی اور وہ انیس ہی کے ساتھ رہے۔

محمد حسین آزاد اور انیس کی ملاقات

آزاد اپنے باپ مولوی سید محمد باقر کی سزائے موت کے بعد محنت مزدوری کرتے ہوئے لکھنؤ پہنچے جو اس وقت تک فتح نہیں ہوا تھا۔ لکھنؤ میں ارسطو جاہ کے بیٹوں شریف حسن خان

اور شریف حسین خان (شریف العلما) کے ساتھ انھوں نے انیس سے ملاقات کی۔ وہ مقتول باپ کے مفرور بیٹے تھے اس لیے انھوں نے انیس پر اپنا حال ظاہر نہیں کیا۔

انیس نے آتش کی نماز والا واقعہ ظاہراً اسی موقعے پر سنایا تھا۔ انھیں گفتگوؤں میں آزاد نے انیس کے سامنے ذوق کا یہ مطلع سنایا تھا:

کوئی آوارہ تیرے نیچے اے گردوں نہ ٹھہرے گا
ولیکن تو بھی گر چاہے کہ میں ٹھہروں نہ ٹھہرے گا

اس کا ذکر آزاد نے اپنے مرتب کیے ہوئے ''دیوان ذوق'' اور ''آبِ حیات'' دونوں میں کیا ہے۔ انیس نے مطلع پسند کیا، کئی بار آزاد سے پڑھوایا اور خود بھی پڑھا۔ چلتے ہوئے پھر کہا کہ ذرا وہ شعر پڑھتے جایئے گا اور کہا کہ دوسرے مصرعے میں قافیہ ایسے پہلو سے بیٹھا ہے کہ وہ اسی کا حق ہے اور یہ کہ جو لفظ جس مقام پر استاد نے رکھ دیا ہے اسی طرح پڑھا جائے تو ٹھیک ہوتا ہے نہیں تو شعر رتبے سے گر جاتا ہے۔

☆☆............☆☆

آٹھواں باب

انگریزی عہد میں

آزادی کی اس پہلی بڑی جنگ میں ناکامی اور بربادی کا لازمی اثر یہ ہونا تھا کہ ہندوستان شکست خوردگی اور کمتری کے شدید احساس میں مبتلا ہو جائے۔ لکھنؤ بھی اس اثر سے آزاد نہیں تھا۔ ہندوستانیوں میں یہ احساس پھیل گیا تھا کہ ہماری معاشرت، ہمارے فنون، ہماری زبان و ادب، ہر چیز پست درجے کی ہے اور انگریز ہر معاملے میں ہم سے بہتر اور برتر ہیں۔ اس احساس کے تحت بہت سے اہل شہر مضحکہ خیز حد تک انگریزوں کی نقالی کرنے لگے تھے اور بعض نے تو اردو بھی انگریزوں کی طرح بولنا شروع کر دی تھی۔ اسی لیے انیس نے کہا:

الٹ گیا نہ فقط لکھنؤ کا اک طبقہ
انیس ملک سخن میں بھی انقلاب آیا

اُودھ پر انگریزوں کا مکمل تسلط ہو جانے کے بعد کچھ عرصے تک لکھنؤ کی یہ حالت رہی کہ عہد شاہی میں اس کی رونق اور ثروت دیکھنے والے اس کے گرے ہوئے مکانوں، اجڑی ہوئی ڈیوڑھیوں اور خستہ حال باشندوں کو دیکھ کر مشکل سے یقین کر پاتے تھے کہ یہ وہی شہر ہے جو شاہی زمانے میں بیت السلطنت تھا۔ انیس کے کلام میں اس انقلاب کی طرف اشارے ملتے ہیں، مثلاً:

مکیں رہے نہ مکاں طرفہ کارخانہ ہوا — زمیں الٹ گئی کیا منقلب زمانہ ہوا
یہ انقلاب غضب کا ہے یا علی فریاد — کہ مسجدیں تھیں جہاں واں شراب خانہ ہوا

....

کیونکر دل غم زدہ نہ فریاد کرے   جب ملک کو یوں غنیم برباد کرے
مانگو یہ دعا کہ پھر خداوندِ کریم   اجڑی ہوئی مملکت کو آباد کرے

افسوس زمانے کا عجب طور ہوا   کیوں چرخ کہن یہ کیا نیا دور ہوا
گردش کب تک ، نکل چلو جلد انیس   اب یاں کی زمیں اور فلک اور ہوا

....

ایک بڑا انقلاب لکھنؤ کی مشہور عزاداری میں آتا معلوم ہو رہا تھا۔عزاداری کی بہت سی رونق اور شان وشوکت بہ ظاہر لکھنؤ کے ان بے شمار رئیسوں کے دم سے تھی جو عزاداری پر بے حساب پیسہ صرف کرتے تھے۔ عام لوگ بھی اپنی بساط سے بہت بڑھ کر تعزیہ داری میں خرچ کرتے تھے۔ اب رئیس تباہ حال اور عوام بے روزگار تھے۔ مالیات پر انگریزوں کا قبضہ تھا۔لکھنؤ ایک مفلس شہر بنا ہوا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لکھنؤ کی عزاداری کا چل چلاؤ ہے۔انیس نے انقلاب کے بعد کے برباد عزاداروں کی مدح میں کچھ بند کہے تھے جن میں کے دو حسب ذیل ہیں:

گو لٹ گیا ہے سب کا لباس و متاع و مال   ان مہ وشوں کو کچھ نہیں صدمہ یہ ہے کمال
ہر دم عزائے مہر امامت کا ہے خیال   حاصل وہ دولتیں ہیں کہ جن کو نہیں زوال
کیا غم لٹے لباس جو دنیا سے زشت کے
یہ سب پہننے والے ہیں حُلّے بہشت کے

ہر چند بے اثاث ہیں یہ آسماں اساس   رازق کا آسرا ہے فقط اور سب سے یاس
نہ پیرہن درست نہ زر ہے کسی کے پاس   زیبا مگر گلوں کی طرح ہیں پھٹے لباس
جوہر شناس ان کے امام جلیل ہیں
کہنہ ہیں گو لباس پہ تیغیں اصیل ہیں

عزاداری تو باقی تھی لیکن اس کی گزشتہ شان کا معرض خطر میں پڑنا انیس کے لیے جن کی

روزی مجالس عزا میں مرثیہ خوانی ہی سے چلتی تھی، اندیشے اور تشویش کی بات تھی۔ انھی مجلسوں کی بدولت انھیں رئیسوں سے صلے اور ہدیے ملتے تھے۔ اب رئیسوں کی تعداد بہت گھٹ گئی تھی اور جو باقی تھے وہ انقلاب سے پیدا ہونے والے ذاتی مسائل میں الجھے ہوئے تھے۔ مونس کا یہ شعر اسی صورتِ حال کا اظہار کرتا ہے:

مونس ابھی تو حال کی ہے سب کو اپنے فکر
پوچھے گا ہم کو ہاں جو کوئی قدر داں رہا

عام نظروں میں انیس کو جو وقار حاصل تھا وہ بھی زیادہ تر مجالس عزا کے طفیل میں تھا، اس لیے عزاداری کا تاریک نظر آتا ہوا مستقبل خود انیس کے بھی مستقبل کو مالی اور سماجی دونوں حیثیتوں سے تاریک دکھا رہا تھا اور شہر پر چھائی ہوئی بے دلی، مردنی اور مایوسی کی فضا اس تاریکی کو بڑھا رہی تھی۔

مگر یہ کیفیت بہت دن نہیں رہی۔ لکھنؤ والوں کی فطری زندہ دلی اور ولولے نے شہر کی بے رونق فضا کو تیزی سے بدلنا شروع کیا۔ عظمت علی کاکوروی لکھنؤ کی تباہیوں کا ذکر کر کے لکھتے ہیں:

"لیکن واہ ری بے فکریٔ شہر، چشم بد دور، یہ سب صحیح، پر عیش باغ کے میلے اور محرم کی عزاداریوں کے مجموں کے دیکھتے شہر کا کچھ نہیں بگڑا۔"

اس صورت حال کی وجہ سے انیس کا وہ وقار اور سماجی مرتبہ برقرار رہا جو انھیں صفِ اول کے مرثیہ گو اور مرثیہ خوان کی حیثیت سے حاصل تھا، لیکن معاشی اعتبار سے ان کے لیے حالات اطمینان بخش نہیں رہ گئے تھے۔

انتزاع کے بعد ہمیں انیس کے مزاج خصوصاً رئیسوں کے ساتھ رویے میں تبدیلی نظر آتی ہے۔ لکھنؤ میں اب جو رئیس باقی تھے ان میں اکثریت انھی کی تھی جن کو انگریزی حکومت میں سرخ روئی حاصل تھی اس لیے کہ انھوں نے انتزاع سلطنت میں اور اس سے بڑھ کر جنگ کے دنوں میں انگریزوں کی حمایت یا مدد کی تھی۔ گویا انگریزوں کی فتح اور ہندوستانیوں کی شکست میں ان کا بھی ہاتھ تھا۔ وہ "خیر خواہانِ دولت انگلشیہ" میں شمار ہوتے تھے۔ اسی لیے ان کی امارت برقرار

رہنے دی گئی تھی۔ انیس کا گزارا اب بھی رئیسوں کی داد و دہش پر تھا اور کئی نامی رئیس ان کے قدر دان بلکہ نیاز مند تھے، انیس بھی ان میں بعض کو عزیز رکھتے تھے، لیکن عمومی طور پر اس دور میں رئیسوں کے ساتھ ان کا رویہ تحقیری سا ہو گیا تھا۔ احسن بیان کرتے ہیں:

''ایک روز میر انیس غریب خانے پر تشریف رکھتے تھے کہ ایک رئیس کی گاڑی سامنے سے گزری۔ رئیس نے کوچوان سے اشارہ کیا کہ گاڑی آہستہ آہستہ لے چلے تاکہ میر صاحب متوجہ ہوں تو سلام کر لیں۔ میر صاحب نے فوراً ارادہ سمجھ لیا اور اس جانب سے منھ پھیر کر کسی اور شخص سے گفتگو کرنے لگے۔ مگر کن انکھیوں سے دیکھتے جاتے تھے اور والدِ مرحوم سے پوچھتے جاتے تھے کہ میر حسن علی، گاڑی نکل گئی؟ والد نے عرض کیا کہ حضور ہاں۔ تو فرمایا، لاحول ولاقوۃ۔ کیا میں پریشان ہوا ہوں۔ والدِ مرحوم نے کہا کہ حضور، وہ منتظر تھے کہ سلام کر لیں۔ کیا مضائقہ تھا جو آپ اس طرف توجہ کرتے۔ میر صاحب نے فرمایا کہ اس شخص کی صورت سے مجھے نفرت ہے۔ اس نے سلطنت سے بے ایمانی کی ہے اور ہزاروں بے گناہوں کی گردن پر چھری پھیری ہے۔ میں کیا ہوں، رحمت خدا نے بھی ایسے لوگوں کی جانب سے منھ پھیر لیا ہے۔''

ایک اور واقعہ احسن نے بیان کیا ہے کہ:

''ایک دن جب انیس نماز جماعت پڑھنے کے لیے تحسین کی مسجد میں آئے ہوئے تھے، ایک رئیس کھڑے ہو گئے۔ انیس نے دیکھا اور ان کا ارادہ پہچان کر کسی دوسری طرف مخاطب ہو گئے۔'' ایک صاحب نے عرض کیا کہ کوئی صاحب امیدوار سلام ہیں...... انیس نے ...... دوسری جانب رخ پھیر کر فرمایا کہ کہاں؟ دوسرے صاحب نے اشارہ کیا کہ اس

طرف ملاحظہ فرمائیے۔ میر صاحب نے تیسری جانب رخ پھیرا اور فرمایا
کہ کہاں ہیں صاحب؟ آخر رئیس صاحب شرمندہ ہو کر بیٹھ گئے۔''

....

شاہی لکھنؤ سے گزر کر اس نئے لکھنؤ میں آنے کے بعد انیس کا کچھ زمانہ کس مپرسی کے عالم میں گزرا۔ دوسرے مرثیہ گویوں کا بھی کچھ یہی حال تھا۔ انیس کے ایک شاگرد لطیف کا مقطع ہے:

لطیف تم نے کہا نہ کیا کچھ مگر نہ اصلا کسی نے پوچھا
مزہ سخن کا تھا جن کے دم سے جہاں سے گزرے وہ وادریغا
ہزار افسوس گر نہ لٹتا ریاض خوش رنگ لکھنؤ کا
تباہ برگِ خزاں کی صورت نہ ذی کمالوں میں کوئی ہوتا
نہالِ باغِ سخن کا ہرگز ثمر کسی جا نہ اب ملے گا
محیط لطف وسخا کا ستم کو گہر کسی جا نہ اب ملے گا

لیکن رفتہ رفتہ حالات کچھ معتدل ہوئے اور انیس کے قدر دانوں کا ایک حلقہ بن گیا۔ یہاں ان قدر دانوں کا بہت مختصر تعارف مناسب معلوم ہوتا ہے۔

امجد علی خاں، نواب: منورالدولہ احمد علی خاں وزیر اعظم اودھ کے بیٹے، اپنے وقت کے سب سے بڑے رئیسوں میں تھے۔ انیس اور مونس کے شاگرد تھے اور انیس کے پاؤں دبانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ انیس سے مل کر جب جاتے تو دروازے پر کسی خادمہ کو بلوا کر رومال میں بندھی ہوئی اشرفیاں اس کو دیتے اور کہتے تھے یہ رومال کسی ایسی جگہ ڈال دینا کہ بیگم صاحب کی نظر اس پر پڑ جائے۔ یہ نہ کہنا کہ کون دے گیا ہے۔

نواب امجد علی خاں نے ''ردمظالم'' کے وقف سے انیس کے بیٹوں رئیس اور سلیس کے وظیفے بھی مقرر کیے تھے۔

حامد علی میر: میر حامد علی لکھنؤ کے خوش حال اور ذی علم شخص تھے۔ ساری عمر کتب بینی میں صرف کی حافظہ بہت قوی تھا۔ انیس سے بے حد عقیدت رکھتے تھے۔ روزانہ کئی گھنٹے انیس کی صحبت میں رہنے کے باوجود آخر عمر میں کہتے تھے کہ اب میں کلام انیس کو کچھ کچھ سمجھنے لگا ہوں۔

زکی علی خاں، نواب: شاگرد انیس۔ اکثر انیس کی صحبت میں رہتے تھے۔ ان کا خاندانی سلسلہ اودھ کی مشہور تاریخی شخصیتوں خان علامہ تفضل خان، سرفراز الدولہ حسن رضا خاں وغیرہ سے ملتا تھا۔ زکی کے پرنانا نواب تجمل حسین خان کے امام باڑے میں انیس اور نفیس مرثیہ پڑھتے تھے۔ ان کے بیٹے مرزا علی محمد خاں کے مکان (کٹڑا ابوتراب خاں) میں انیس کے پوتے دولہا صاحب عروج کی سکونت تھی اور اسی مکان میں ان کی وفات ہوئی۔

سید علی دلھی پوری، حکیم: دلھی پور بنارس کے حکیم سید علی اور ان کے بھائی سید صادق انیس کے سب سے بڑے قدر دانوں اور عقیدت مندوں میں تھے۔ انیس بھی ان کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ ان کے نام انیس اور خاندان انیس کے خطوط بہت اہم ہیں۔ انس کو اپنے باغ کے آم تحفتہً بھیجا کرتے تھے۔ انیس کی مجلسیں سننے کے لیے حکیم سید علی لکھنؤ تک آتے تھے۔ انیس ان کے یہاں مجلس پڑھتے اور کبھی محض مہمان کے طور پر دلھی پور جاتے تھے جہاں ان کی بڑی خاطریں ہوتی تھیں۔

عالی جاہ، والا جاہ: دلیر الدولہ مرزا حیدر کے ان دونوں فرزندوں کے نام لکھنؤ میں عموماً اعلیٰ جاہ والا جاہ کر کے لیے جاتے تھے۔ خلیق ترقی کے رفیق تھے۔ مرزا حیدر کے بڑے بیٹے زکی انیس کے شاگرد تھے۔ عالی جاہ اور واجاہ بھی شاعر تھے۔ مرزا عالی جاہ کو محمد علی شاہ کی ایک بیٹی منسوب تھیں۔ ۵۷ء کے آشوب میں یہ دونوں بھائی حج وزیارات کو گئے ہوئے تھے۔ واپس آئے تو لکھنؤ میں جو مال و دولت رکھ گئے تھے اسے ہندوستانی فوجیوں نے لوٹ لیا تھا۔ والا جاہ کے بیٹے مرزا مہدی حسین آغا ابو کے نام سے مشہور تھے۔ یہ لکھنؤ کا بڑا مقتدر اور دولت مند خاندان تھا۔ یہاں انیس نے آخری عمر کی مجلسیں پڑھی تھیں۔ لکھنؤ کے محلے ترمنی گنج میں اس خاندان کی سکونت تھی۔

محمد حسین خاں، نواب میر: ان کا شمار بھی لکھنؤ کے رئیسوں میں تھا۔ آغا میر کے نواسے تھے اور ایک ہزار وثیقہ پاتے تھے۔ عزاداری میں بڑا انہماک تھا۔ ہر قمری مہینے کی چھبیسویں تاریخ کو آغا میر کی ڈیوڑھی میں اپنے مکان پر مجلس کرتے تھے۔ اس میں انیس بھی پڑھتے تھے۔ مونس کے شاگرد اور انیس کے شیدائی تھے۔

محمد عباس، میرزا: انھیں کے یہاں آشوب کے دنوں میں انیس نے قیام کیا تھا۔ انیس کے عزیز شاگرد تھے۔ کلکتہ میں کچھ لوگوں نے انھیں انیس کا شاگرد ماننے سے انکار کیا تو انیس نے ایک خط لکھ کر شاگردی کی توثیق کی۔

محمد محسن، ذوالقدر: جون پور کے رئیس تھے۔ مونس نے ان کو انیس کا شاگرد کرا دیا تھا۔ ان کے باپ کو آشوب میں انگریزوں کی خدمت کے صلے میں جاگیر اور موروثی خطاب ذوالقدر ملا تھا۔ محسن کو انیس کا کلام قریب قریب حفظ تھا اور وہ اس میں نئے نئے معنی پیدا کرتے تھے۔

ممتاز العلما سید تقی صاحب مجتہد: جید عالم دین تھے انیس ان سے سولہ برس بڑے ہونے کے باوجود ان کا احترام کرتے تھے۔ ان کا امام باڑہ، کتب خانہ اور مکان انیس کی آخری قیام گاہ سے قریب تھا اور وہ انیس کے بڑے قدردان تھے۔

سرکارِ انگریزی سے انیس کا وظیفہ

انتزاع سلطنت نے انیس کی آمدنی کے بہت سے راستے مسدود کر دیے تھے اور حکومت کی تبدیلی ان کے لیے نامبارک ثابت ہوئی تھی۔ لیکن انگریزی حکومت انھیں پندرہ روپے ماہوار وظیفہ بھی دیتی تھی۔ یہ وظیفہ ان کو میر حسن کے پوتے ہونے کی بنا پر ملتا تھا جن کی مثنوی ''سحر البیان'' فورٹ ولیم کالج کے نصاب میں داخل اور وہاں کی مطبوعات میں شامل تھی۔

آشوب کے بعد انیس کی پہلی مجلس

آشوب کے بعد انیس نے پہلی مجلس نواب تجمل حسین خاں کی بارہ دری میں پڑھی۔

مفتی میر عباس بھی شریک مجلس تھے۔ کثیر مجمع تھا اور ہر مذہب وملت کے لوگ موجود تھے۔ انیس نے یہ رباعی پڑھی:

امید کسے تھی بزم کے بھرنے کی
اللہ جزا دے اس کرم کرنے کی
آنکھیں کو کہاں کہاں بچھاؤں میں انیس
ملتی نہیں جا بزم میں تل دھرنے کی

اور جو مرثیہ پڑھا اس کے کچھ بند حسب ذیل ہیں:

جاتا ہے شیر بیشۂ حیدر فرات پر — طاری ہے خوفِ مرگ ہر اک ذی حیات پر
صدمہ عجب ہے بادشاہِ کائنات پر — آنکھوں سے اشک بہہ رہے ہیں بات بات پر
بجھتا ہے وہ جو قبرِ علی کا چراغ ہے
جو حال ہو بجا ہے کہ بھائی کا داغ ہے

....

یہ دھوپ یہ خیام کا جلنا یہ گرم بن — مرجھا گیا ہے احمد مختارؐ کا چمن
مانندِ غنچہ پیاس سے کھولے ہیں لب و دہن — پانی بغیر اب نہ جئیں گے وہ گل بدن
گرمی سے ہاتھ پاؤں غریبوں کے سرد ہیں
نیلے ہیں ہونٹ پھول سے رخسار زرد ہیں

چلّایا شمر تب کہ عبث ہے سوالِ آب — دیں گے زبانِ تیغ سے ہم آپ کو جواب
بچوں کی پیاس سے جو ہے حضرت کو اضطراب — پھر کس لیے ہے بیعت حاکم سے اجتناب
خیمے سے گھٹنیوں اگر اصغر بھی آئے گا
جز آبِ تیر پانی کا قطرہ نہ پائے گا

....

گھبرا کے نزع میں علی اکبر نے یہ کہا   اے شاہزادۂ دو جہاں میں ترے فدا
میرا تو کوچ ہے طرف گلشن بقا   فرزندِ فاطمہؑ سے خبردار اب ذرا
گر منع بھی کریں تو اکیلا نہ چھوڑیو
عمو نثار باپ کو تنہا نہ چھوڑیو

یہ کہہ کے پائے شاہ کی جانب بڑھایا سر   کانپے لہو بھری ہوئی آنکھوں کو کھول کر
ٹپکے مژہ سے خون کے قطرے اِدھر اُدھر   کس یاس سے حسینؑ پہ کی آخری نظر
منکا جری کا ڈھل گیا بھائی کی گود میں
بھائی کا دم نکل گیا بھائی کی گود میں

آشوب کے بعد اس مجلس کا کثیر مجمع انیس کے لیے خلافِ توقع تھا لیکن وہ یہ سمجھنے میں حق بہ جانب تھے کہ اب تنہا لکھنؤ ان کی کفالت نہیں کر سکتا اور انھیں کسبِ معاش کے لیے دوسرے شہروں کی طرف بھی دیکھنا پڑے گا۔

ان دوسرے شہروں میں پہلا شہر عظیم آباد (پٹنہ) تھا۔

عظیم آباد کی مجلسیں

عظیم آباد میں عشرۂ محرم کی مجلسیں انیس نے ۱۲۷۶ھ/۱۸۵۹ء سے پڑھنا شروع کیں۔ محرم ہجری سال کا پہلا مہینا ہے جس کا عشرہ دور کے شہروں میں پڑھنے کے لیے عشرۂ مجالس سے قبل والے سال میں سفر کرنا ہوتا تھا۔ انیس بھی عظیم آباد میں ۱۲۷۶ھ کی مجلسیں پڑھنے کے لیے ۱۲۷۵ھ میں لکھنؤ سے روانہ ہوئے۔ اس سال کے آخری مہینے ذی الحجہ کی ساتویں تاریخ (مطابق ۹/جولائی ۱۸۵۹ء) کو ان کا پڑاؤ بنارس میں تھا جہاں لکھنؤ کے ایک اور وطن آوارہ مصنف رجب علی بیگ سرور نے ان سے ملاقات کی۔

بنارس عظیم آباد کے راستے میں پڑتا تھا۔ دبیر بھی عظیم آباد جا رہے تھے۔ اس زمانے

میں جون پور کے مولوی باقر حسین بنارس میں طالب علم تھے۔ وہ اپنے استاد کے ساتھ پہلے انیس سے ملنے گئے۔ وہ معمولی تعظیم و تکریم کے بعد استاد سے باتیں کرتے رہے۔ طلبہ کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ اس کے بعد دبیر سے ملنے پہنچے تو اُن کو بہت خلیق پاتا۔ انھوں نے کھڑے ہو کر معانقہ کیا اور بڑے تپاک سے بٹھایا۔ طلبہ سے بھی دیر تک ان کے نصاب وغیرہ کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔

بنارس میں انیس و دبیر دونوں مجلسیں پڑھیں۔ مولوی باقر حسین لکھتے ہیں کہ انیس نے تیلیا نالے میں قاضی یار علی خاں کے امام باڑے میں مجلس پڑھی۔ ''بڑی واہ واہ اور بڑی رقت ہوئی۔ غل سے امام باڑے کی چھت پھٹنے کا خوف تھا۔ آدمیوں کی کثرت تھی کہ ایک دوسرے پر گرتا تھا۔ جب میر صاحب منبر پر سے اترے تو آٹھ نو آدمی فرش پر بے ہوش تھے۔''

انیس نے اس مجلس میں مرثیہ ''جب رن میں سر بلند علیؑ کا علم ہوا'' پڑھا۔ بنارس میں یہ انیس کی پہلی مجلس تھی اور انیس جناب عباسؑ کا حال پڑھ رہے تھے:

پہنچے جو دشتِ کیں میں اڑاتے ہوئے فرس   گھوڑے کو ہاتھ اٹھا کے یہ آواز دی کہ بس
دیکھیں صفیں جمی جو چپ و راس و پیش و پس   نعرہ کیا کہ نہر پہ جانے کی ہے ہوس
روکے گا جو وہ موت کے پنجے میں آئے گا
ہٹ جاؤ سب کہ شیر ترائی میں جائے گا

بولے یہ بڑھ کے فوج مخالف کے پہلواں   دیکھے نہیں کبھی کہ ہٹے لشکر گراں
یاں سب ہیں روم و شام کے جنگ آزما جواں   ہاں آیئے تو کھینچ کے تیغِ شرر فشاں
بودے نہیں ہیں کچھ جو نگہباں ہیں گھاٹ کے
سر پھینک دیں گے نہر میں خنجر سے کاٹ کے

سنتے ہی یہ جلال میں آیا علیؑ کا لال   نعرہ کہا کہ تم ہمیں روکو گے کیا مجال
یہ مورچے ہیں کیا ہمیں جن کا ہو کچھ خیال   اک دم میں چیونٹیوں کی طرح ہو گے پائمال

بھاگو گے پھینک پھینک کے تیغیں لڑائی سے
لو مرد ہو تو اب نہ سرکنا ترائی سے

....

مشہور ہے کہ ایک پہ بھاری ہیں دو بشر　　پیاسے تھے ان کے خون کے دو لاکھ اہل شر
کھائے اِدھر سے زخم جو کی اُس طرف نظر　　کس کس کا وار رد کریں دیکھیں کدھر کدھر
جب دم لیا تو سینے پہ سو تیر چل گئے
پہلو کو توڑ توڑ کے نیزے نکل گئے
سینہ سپر تھا، مشک پہ رو کے ہوئے تھے ڈھال　　لڑنے میں بھی حسینؑ کے بچوں کا تھا خیال
کہتا تھا ڈگمگا کے فرس پر وہ خوش خصال　　فرزند کو سنبھالیے یا شیر ذوالجلال
جا پہنچوں مشک لے کے جو تھوڑی سی راہ ہو
ایسا نہ ہو کہ پیاسوں کی کشتی تباہ ہو

....

عظیم آباد میں انیس کے میزبان نواب قاسم علی خاں اور اُن کے بھتیجے (نواب بہادر) ولایت علی خاں تھے۔ انیس، مونس اور دبیر (جن کو امام باندی بیگم نے بلوایا تھا) ایک ہی اسٹیمر پر بنارس سے چلے تھے۔

انیس کی پہلی مجلس شروع ہوئی تو آخری صف کے سامعین نے کہا کہ اُن کو آواز ٹھیک سے سنائی نہیں دے رہی ہے۔ اس پر انیس نے ''مرثیہ روک لیا اور پھر سنبھل کر پڑھنا شروع کیا۔ ساتھ ہی یہ بھی دریافت فرمایا کہ آواز پہنچ رہی ہے یا اور تیز کروں۔ مجمعے نے ہاتھ اٹھا کر کہا کہ آواز صاف آ رہی ہے۔ آپ پڑھیں۔''

انیس کی ابتدائی تین مجلسوں میں شاد شریک نہیں ہوئے تھے، اس لیے کہ وہ انیس سے پہلے مل چکے تھے اور ان کو انیس کے رویے میں روکھا پن محسوس ہوا تھا، دوسرے ان کا گھرانا دبیر کا

معتقد تھا۔ چوتھی محرم کو شاد مکانِ مجلس کے ایک حصے میں ستار ہے تھے کہ:

دفعتہً توالی و بلا وقفہ تعریفوں کا غل ہونے لگا۔ جب معلوم ہوا کہ میر انیس پڑھ رہے ہیں، فوراً کپڑے پہنے اور ادھر آ کے دیکھا تو اللہ الصمد! سارا صحن، دونوں طرف پورب پچھم کی چھتیں، آگے کا برآمدہ، اند کا ہال، سب بھرا ہوا ہے۔ میر انیس ہال کمرے میں پورب طرف ایک چھوٹے سے سیاہ پوشش کے منبر پر پڑھ رہے ہیں۔ ایک طرف میر مونس کھڑے رومال جھل رہے ہیں، دوسری طرف میر سید محمد ہیں۔ اس وقت انیس یہ مرثیہ پڑھ رہے تھے:

پانی نہ تھا وضو جو کریں وہ فلک جناب — پُرتھی رخوں پہ خاک تیمم سے طرفہ آب
باریک لہر میں نظر آتے تھے آفتاب — ہوتے ہیں خاکسار غلامِ ابو تراب
مہتاب سے رخوں کی صفا اور ہو گئی
مٹی سے آئینوں پہ جلا اور ہو گئی

....

چیونٹی بھی ہاتھ اٹھا کے یہ کہتی تھی بار بار — اے دانہ کش ضعیفوں کے رازق ترے نثار
یا حی ویا قدیر کی تھی ہر طرف پکار — تہلیل تھی کہیں، کہیں تسبیحِ کردگار
طائر ہوا میں محو، ہرن سبزہ زار میں
جنگل کے شیر ہونک رہے تھے کچھار میں

....

گھوڑوں کی جُست وخیز سے اٹھا غبارِ زرد — گردوں میں مثلِ شیشۂ ساعت بھری تھی گرد
تودہ بنا تھا خاک کا مینائے لاجورد — کوسوں سیاہ و تار تھا سب وادی نبرد
پنہاں نظر سے نیّرِ گیتی فروز تھا
ڈھلتی تھی دوپہر پہ نہ شب تھی نہ روز تھا
کوسوں کسی شجر میں نہ گُل تھے نہ برگ وبار — ایک ایک نخل جل رہا تھا صورتِ چنار

ہنستا تھا کوئی گل نہ لہکتا تھا سبزہ زار　　　کانٹا ہوئی تھی سوکھ کے ہر شاخِ باردار
گرمی یہ تھی کہ زیست سے دل سب کے سرد تھے
پتے بھی مثلِ چہرۂ مدقوق زرد تھے

....

عظیم آباد میں انیس نے کئی سال کے عشرے پڑھے جن میں ان کی مرثیہ خوانیوں وغیرہ کا سب سے تفصیلی ذکر شاد نے کیا ہے۔ ان کے بیانوں کے کچھ منتخب حصے درج ذیل ہیں:

''دوسرے سال تینوں بھائی یعنی میر انس بھی ساتھ آئے۔ میر مونس، میر انیس کے صرف بھائی نہ تھے، غلام تھے، عاشقِ دلدادہ تھے۔ انیس کے لحاظ سے اور ڈر سے چُست ہو کر نہیں پڑھتے تھے...... دب دب کر مصرع پڑھتے تھے۔ میر انیس برابر جھڑکیاں دیتے جاتے تھے۔ ''نہیں! کیسا پڑھ رہے ہو؟'' میر مونس ہاتھ باندھ کر عرض کرتے جاتے تھے، ''بھیا! سب تو مشتاق حضور کے ہیں۔ مجھ کو کوئی نہیں سنتا۔'' وہ خفا ہو کر کہتے کہ سب سنتے ہیں۔ لوگوں کو مخاطب کرتے اور کہتے کہ اس کا قلم سولی پر بھی نہیں رکتا۔ کسی مصرع کو خود دُہرا دیتے کہ یوں پڑھو جس برس میر اُنس بھی بلائے گئے تھے، بعد میر مونس کے ان کی باری آتی تھی۔ میں میر مونس کے پڑھنے پر خوب غور کیا کرتا تھا کہ کون سی بات اٹھا رکھتے ہیں تو اس وقت یہی معلوم ہوتا تھا کہ آج تو میر انیس کا پڑھنا اس کے برابر ہو ہی نہیں سکتا۔ پھر میر انس کو سن کر دل کہتا تھا کہ بس آج تو ان دونوں صاحبوں نے میر انیس کی ذاکری پھیکی کر دی۔ اس کے بعد جب لوگ میر انیس پر اصرار کرنے لگتے تو مجھ کر برا معلوم ہوتا تھا کہ ایسے موقعوں میں ان پر اصرار بے جا ہے مگر جب میر انیس نے شروع کیا تو پہلے ہی مصرع میں مجلس کوری تھی۔

گرمیوں میں لوگوں کا چار چار گھنٹے تک اس گھٹا میں بہ یک نشست بیٹھے رہنا اور کسل مند نہ ہونا انتہا سے اثر کی دلیل ہے۔ جوش میں آ کر بڑے بڑے فاضل و سخن فہم ان کی تعریف میں ایسے ایسے الفاظ بے اختیارانہ کہنے پر مجبور ہوتے تھے جن سے زیادہ الفاظ اور کیا ہوں گے۔ میر مونس تو برابر کھڑے ہوئے مگس رانی کرتے اور لوٹے جاتے تھے۔ میر انس، منبر سے ملے ہوئے، اکثر مصرعوں پر میر انیس کے پاؤں پر سر رکھ دیتے تھے۔''

عظیم آباد کی مجلسوں کا نذرانہ انیس کو قریب چار ہزار اور تحائف اس کے علاوہ ملتے تھے۔ پھر عظیم آباد آتے جاتے انیس بنارس وغیرہ میں رک کر جو مجلسیں پڑھتے، شعر، ان کے نذرانے ملنا بھی یقینی بات ہے۔ اس طرح عظیم آبادی قدر دانوں کی بدولت انیس کو اتنی یافت ہو جاتی تھی جو بعدِ انتزاع کے لکھنؤ میں محدود رہ کر ممکن نہ تھی۔ لکھنؤ کے باقی ماندہ رئیسوں سے انیس کو اس کی امید بھی نہ تھی اور اسی ناامیدی نے ان کو لکھنؤ سے باہر پڑھنے پر مجبور کیا۔ ایک بار عظیم آباد سے واپسی پر بنارس میں انھوں نے کچھ لوگوں کو یہ کہتے سُن لیا کہ یہ کیسے مرثیہ خواں ہیں جو عظیم آباد کو لوٹ لائے۔ اس پر انھوں نے افسردہ ہو کر کہا، فکر ہر کس بہ قدر ہمت اوست۔ ان کو اس پر تعجب ہے، اور مجھ کو اس پر کہ وہ دن آ گئے کہ مجھے لکھنؤ سے باہر جانا پڑا۔

لکھنؤ میں ترکِ مرثیہ خوانی

انتزاع سلطنت سے پہلے تک انیس لکھنؤ کے باہر پڑھنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کرتے تھے کہ ان کے کلام کو اسی شہر کے لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ گویا انیس کی شہرت کے ساتھ اس بات کی بھی شہرت تھی کہ وہ لکھنؤ کے باہر نہ پڑھتے ہیں نہ پڑھنا چاہتے ہیں۔ اب، آشوب کے بعد، ان کی یہ آن ٹوٹ گئی اور یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ اگرچہ عظیم آباد وغیرہ میں ان کی غیر معمولی پذیرائی ہوئی اور اُنھیں داد بھی خوب خوب ملی لیکن وہ اندر ہی اندر خفت سی بھی محسوس کرتے رہے

جس کے نتیجے میں ان کو لکھنؤ اور اہلِ لکھنؤ پر غصہ آنا فطری بات تھی اور لکھنؤ سے باہر نہ پڑھنے کی آن ٹوٹنے کے تکدّر میں انھوں نے نئی آن یہ بنائی کہ خود لکھنؤ میں پڑھنا چھوڑ دیا۔

احسن انیس کے ترکِ مرثیہ خوانی کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ''جب انیس نے عظیم آباد کے سفر کا ارادہ کیا تو لکھنؤ کے رئیسوں نے ان کو روکا نہیں۔ انیس نے اس کو ان لوگوں کی کم ہمتی اور ناقدری پر محمول کیا۔''

مرزا رسوا بھی شکایت کرتے ہیں کہ مرزا دبیر اور میر انیس محرّم میں باہر جایا کیے لیکن ''کبھی لکھنؤ میں کسی کو اتنی توفیق نہ ہوئی کہ ان کے احتیاج کو مہیا کر دیتا تا کہ باہر جانے کی ضرورت نہ پڑتی۔''

انیس کے نواسے مانوس بتاتے ہیں کہ انیس نے ''بھاگڑ کے بعد اُسی سال پڑھنا ترک کر دیا تھا اور چار پانچ سال نہیں پڑھے۔'' ان کے دوسرے نواسے پیارے صاحب رشید نے بھی بتایا کہ ''میر انیس نے بعدِ غدر پڑھنا ترک کر دیا تھا۔''

ترک کے زمانے میں بڑے بڑے مقتدر لوگوں نے انیس کو پڑھنے پر آمادہ کرنا چاہا مگر وہ انکار ہی کرتے رہے۔

☆☆............☆☆

نواں باب

راجا بازار کی سکونت

آشوب کے زمانے میں مرزا عباس کے یہاں ہنگامی سکونت کے بعد جب حالات معتدل ہوئے اور سبھٹی کی املاک واپس ملنے کا امکان نہیں رہا بلکہ وہ املاک ہی نہ رہی تو انیس کو اپنی اور اپنے کنبے کی سکونت کے لیے علیحدہ مکان کی ضرورت ہوئی۔ انھوں نے راجا بازار کے علاقے میں مکان لیا۔ اس مکان کا پتا پنجابی ٹولے اور بیگم گنج سے بھی دیا جاتا تھا۔

اس مکان میں چوری کی ایک واردات ہوگئی جس میں گھر کے بہت سے اسباب کے علاوہ انیس کے چند مرثیے بھی چوری ہو گئے۔ بعد میں یہ مرثیے احمد علی خاں نے خرید کر انیس کو دینا چاہے۔ انیس نے پوچھا کہ یہ انھیں کس سے ملے۔ نواب نے شخص کا نام بتانے سے انکار کیا تو انیس نے مرثیے واپس لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ صاحب میرا دماغ تو نہیں لے گئے ہیں۔ میں اور کہہ لوں گا۔

اس نے حکیم سید علی کے نام ایک خط میں اپنے دو تازہ مگر ناتمام مرثیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:

''چونکہ بیماری کی حالت میں کہے گئے ہیں اس لیے سرسری ہیں۔ ان مرثیوں کی برابری نہیں کر سکتے جو چوری میں غارت ہو گئے۔''

یہ مرثیے انیس کی وفات کے بعد میر علی محمد عارف کے حوالے کیے گئے۔

سیّاں شہدا اور انیس

شُہدے خوشی کی تقریبوں میں مبارکباد دے کر انعام وصول کرتے تھے۔ ان سے میت اٹھانے کا کام بھی لیا جاتا تھا۔ جوا کھیلنا (اور غالباً کھیلانا بھی) ان کا خاص شغل تھا۔ لکھنؤ میں شُہدے دل

کی عزاداری مشہور تھی۔ شہدوں کو اگر مبارکباد کا انعام نہیں دیا جاتا تھا تو وہ صاحب خانہ پر پھبتیاں کسنے لگتے تھے۔ کبھی کبھی لوگ محض ان کی پھبتیاں سننے کے شوق میں ان کو انعام دینے میں دیر لگاتے تھے۔
سیاں انیس کے زمانے میں لکھنؤ کا مشہور شہدا تھا۔ میرزا یگانہ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے:

مجھ کو یگانہ سنگِ ملامت کا خوف کیا
میں تو وہ پاک شُہدا ہوں سیّاں کہیں جسے

سیّاں انیس کے سکونتی محلے راجا بازار میں رہتا تھا۔ ایک بار وہ انیس کے یہاں کسی تقریب کی مبارکباد دینے پہنچا۔ دیر تک ڈیوڑھی میں کھڑا دعائیں دیتا رہا لیکن انیس نے اسے کچھ نہیں بھجوایا۔ آخر وہ یہ کہتا ہوا وہاں سے چل دیا کہ "جاؤ میر صاحب، یزید کو دعائیں دو جس کے کیے کی روٹی کھاتے ہو۔ نہ وہ مولا کو شہید کرتا، نہ تم ان کا دکھڑا روتے۔"

راجا بازار کے زمانۂ قیام میں علی اوسط رشک کا لغت "نفس اللغو" انیس کے پاس تھا اور وہ اس میں چُھوٹے ہوئے لفظ بڑھاتے تھے۔

اسی زمانے میں انیس کے چھوٹے بیٹے سلیس کے یہاں ابومحمد جلیس کی ولادت ہوئی۔ انیس ان کو عزیز رکھتے اور ابو میاں کہتے تھے۔ ان کا تخلص بھی انیس نے رکھا۔

علی محمد عارف کی ولادت ۲۸ نومبر ۱۸۵۹ء (۳ جمادی الاوّل ۱۲۷۶) کو ہوئی۔ وہ انیس کی پوتی (دخترِ نفیس) کے بیٹے تھے۔ عارف اپنے وقت کے بہترین مرثیہ گویوں اور مرثیہ خوانوں میں شمار ہوتے تھے۔

قربان علی بیگ سالک سے ملاقاتیں

مرزا قربان علی بیگ سالک ۱۸۶۱ء (۷۸-۱۲۷۷ھ) میں لکھنؤ میں تھے۔ یہاں ان کی انیس سے بھی ملاقاتیں ہوئیں جن کا حال سالک نے اپنے روزنامچے میں لکھا ہے۔ مثلاً:

"ایک روز میر صاحب سے دلی کا ذکر آ گیا۔ طرزِ بیان سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب تک ان کے دل میں دلّی بسی ہوئی ہے۔ اپنی جائے سکونت

کو فرمانے لگے، یہ اسی باغ کا سبزہ زار ہے۔ ایک روز فرمانے لگے...... کچھ دلّی کا کلام سناؤ۔ میں نے میرزا غالب کی یہ غزل پڑھی:

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

پھر اپنی غزل پڑھی۔ اس کا ایک شعر ہے:

دنیا میں مجھے خاک اڑانے نے ڈبویا
ہر بار نکل آتا ہے دریا مرے آگے

اس شعر پر فرمایا، ''خوب کہا ہے'' یہ کہہ کر فرمانے لگے، لکھنؤ والے روکے ہے، کھینچے ہے نہیں بولتے اور ڈبویا بھی ان کی زبان پر نہیں، مگر میں لکھ جاتا ہوں۔ انہی ملاقاتوں میں انیس نے غالب کو یگانۂ فن کے لفظ سے یاد کیا اور ذوق و مومن کی نسبت فرمایا کہ ذوق شاہی دربار کے شاعر اور مومن اپنی طبیعت کے بادشاہ ہیں۔ پھر حکیم مومن خاں کا یہ شعر پڑھا:

نہ کچھ شوخی چلی بادِ صبا کی
بگڑنے میں بھی زلف اس کی بنا کی

پڑھنے کے بعد ایک چپ سی لگ گئی، جیسے کوئی حسین عورت سامنے ہے اور ہوا سے اس کی زلف اڑ رہی ہے اور میر صاحب اس کو دیکھ دیکھ کر ادائے کلام کے مزے لے رہے ہیں۔''

اس وقت انیسیوں دبیریوں کی آویزش عروج پر تھی۔ سالک نے خود کو انیس کے طرف داروں میں رکھا۔

۶ جولائی ۱۸۶۲ء (۸ محرم ۱۲۷۹ھ) کو نفیس کے داماد سید محمد حیدر صرف چھبیس سال کی عمر میں وفات پا گئے۔ ان کے بیٹے عارف ابھی تین سال کے بھی نہیں ہوئے تھے۔ انیس کے حکم سے نفیس نے، اپنے یتیم نواسے اور بیوہ بیٹی کو اپنے ساتھ رکھا۔

ترک کے بعد لکھنؤ میں خوانندگی

انیس کے لکھنؤ میں نہ پڑھنے کی وجہ سے لوگ بہت بے چین تھے۔ اس زمانے میں انیس ایک بیماری کے بعد شفایاب ہوئے تھے۔ موقع غنیمت دیکھ کر سید محمد میرزا انس اور میر عشق کے کہنے سے کلن صاحب سعید، برادرِ پیارے صاحب رشید نے انیس سے کہا کہ میں نے منت مانی تھی کہ آپ کو صحت ہو گی تو مجلس کروں گا اور آپ ہی کو پڑھواؤں گا۔ انیس نے سُن کر بہت غصہ کیا اور کہا کہ اگر تم نے مجلس مانی ہے تو کرو۔ میرے پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن کلّن صاحب نے بہت اصرار کیا۔ ادھر محمد علی شاہ کے داماد نواب غضنفر نے بھی ممتاز العلما سید نقی صاحب مجتہد سے سفارش کرائی اور انیس نے لکھنؤ میں نہ پڑھنے کا عہد توڑ دیا اور آغا میر کی ڈیوڑھی میں نیا مرثیہ ''کیا زخم ہے وہ زخم کہ مرہم نہیں جس کا'' (مطلعِ ثانی ''جب باغ جہاں اکبرِ ذی جاہ سے چھوٹا) پڑھا۔ اِس مرثیے کا یہ بند بھی بتا رہا ہے کہ انیس بہت عرصے کے بعد پڑھ رہے ہیں:

کوثر کا بھرا جام پلا دیجیے مولا — بالائے ولا اور ولا دیجیے مولا
پھر غنچۂ خاطر کو کھلا دیجیے مولا — شمشیرِ فصاحت کو جلا دیجیے مولا
میں وہ نہیں یا خلق میں انصاف نہیں ہے
مُدّت سے جو چپ ہوں تو زباں صاف نہیں ہے

یہ ایک یادگار مجلس تھی جس میں انیس ایک مدت کے بعد لکھنؤ کے منبر پر پڑھ رہے تھے:

کیا زخم ہے وہ زخم کہ مرہم نہیں جس کا — کیا درد ہے جُز دل کوئی محرم نہیں جس کا
کیا داغ ہے جلنا کوئی دم کم نہیں جس کا — کیا غم ہے کہ آخر کبھی ماتم نہیں جس کا

کس داغ میں صدمہ ہے فراقِ تن و جاں کا
وہ داغ ضعیفی میں ہے فرزندِ جواں کا

جب باغِ جہاں اکبر ذی جاہ سے چھوٹا پیری میں برابر کا پسر شاہ سے چھوٹا
فرزندِ جواں ابن یداللہ سے چھوٹا کیا اخترِ خورشید لقا ماہ سے چھوٹا
تصویرِ غم و درد سراپا ہوئے شبیرؑ
ناموس میں ماتم تھا کہ تنہا ہوئے شبیرؑ

....

شیر اسدِ قلعہِ شکن گونج رہا تھا جنبش تھی پہاڑوں کو یہ رن گونج رہا تھا
قرنا سے ادھر چرخِ کُہن گونج رہا تھا نعروں سے اِدھر ظلم کا بن گونج رہا تھا
غُل تھا کہ لہو خوف سے گھٹ جانے کا دن ہے
بھاگو یہی گیتی کے اُلٹ جانے کا دن ہے

....

لو خاک پہ گھوڑے سے گرے سبطِ پیمبرؐ تھرائی زمیں ہلنے لگا عرشِ منوّر
سر پیٹتی مقتل کو چلی زینبِ مضطر یاں شمرِ ستمگار بڑھا کھینچ کے خنجر
سر ننگے نجف سے شہِ مرداں نکل آئے
مرقد سے نبیؐ چاکِ گریباں نکل آئے
چلّائے ملائک کہ قیامت ہوئی برپا گھبرا کے درختوں سے اڑے طائرِ صحرا
آندھی ہوئی اک غرب کی جانب سے ہویدا تھرانے لگے کوہ اُبلنے لگے دریا
تیرہ ہوا دن اڑنے لگی خاک جہاں میں
غل ہائے حُسیناؑ کا ہوا کون و مکاں میں

....

طویل ترک کے بعد انیس کے لکھنؤ میں پڑھنے کی خبر ایسی نہیں تھی کہ پھیل نہ جاتی اور دوسروں کو بھی انھیں اپنے یہاں پڑھوانے کا حوصلہ نہ ہوتا لیکن انیس اب بھی پڑھنے پر بہ مشکل راضی ہوتے تھے۔ اِس مجلس کے بعد نواب فدا علی خاں نے انیس کو پڑھوانے کے لیے ان پر اصرار کیا لیکن انیس راضی نہیں ہوئے اور اپنی جگہ ثقلین کو بھیج دیا۔ مجلس کے بعد فدا علی خاں انیس سے ملنے آئے۔ نفیس کے پڑھنے کی بہت تعریف کی لیکن یہ بھی کہا کہ میں ابھی خوش نہیں ہوں۔ آپ کو بھی پڑھنا ہوگا۔

اس کے کچھ دن بعد انیس نے کنکر کنویں پر مجلس پڑھی جو شیخ علی عباس وکیل کے والد داروغہ محمد عباس کرتے تھے۔ نواب فدا علی خاں سے انیس نے پہلے سال انکار کر دیا تھا لیکن دوسرے سال کلن صاحب کے یہاں آدھا مرثیہ پڑھ کر اعلان کیا کہ بقیہ آدھا فدا علی خاں کے یہاں پڑھوں گا۔ یہ مرثیہ ''جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے'' تھا۔ احسن کا بیان ہے کہ اس مرثیے کے پہلے مصرع پر:

> ''ایک صاحب نے غائبانہ اعتراض کیا...... [کہ] مسافت شب ماہتاب طے کرتا ہے نہ کہ آفتاب۔ بات مشہور ہوگئی...... والدِ مرحوم فرماتے تھے کہ میرے سامنے کا واقعہ ہے کہ ایک صاحب تشریف لائے اور اس اعتراض کا واقعہ بیان کیا۔ میر صاحب کا چہرہ سُرخ ہوگیا اور دو مرتبہ فرمایا، ''خیر، دیکھا جائے گا۔'' اور پھر خاموش ہو رہے۔ دوسری مجلس میں جب میر صاحب منبر پر تشریف لے گئے تو مرثیہ شروع کرنے سے پہلے حاضرین کی جانب مخاطب ہو کر فرمایا، سنتا ہوں کہ کسی صاحب نے انیس پر اعتراض کیا ہے...... مگر میں اس کو مخاطب صحیح نہیں سمجھتا جو ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلتا ہے۔ اگر مردِ میدان ہے بر سر معرکہ اعتراض کرے...... چاروں طرف سناٹا تھا۔ کوئی آواز بلند نہ ہوئی اور وہ شیرِ بیشہ وضاحت بہت دیر

تک منبر پر بیٹھا ہوا جھوما کیا۔ آخر نواب محمد حسین خان نے نہایت
ادب سے عرض کیا کہ حضور کا کیا خیال ہے؟ کس کی مجال ہے جو آپ پر
اعتراض کرے۔ میرے نزدیک یہ سب مفسدہ پردازوں کی باتیں ہیں۔
بسم اللہ، مرثیہ شروع کیجیے۔ اس پر بھی ان کا جوش کم نہ ہوا جب تک علم
ہیئت کے استدلال سے فاصلۂ شب میں دورۂ شمسی کو ثابت نہ کر دیا۔''

لکھنؤ میں پڑھنا شروع کر دینے کے باوجود انیس کسی حد تک اپنے ترک پر قائم تھے اور اب صرف خاص خاص احباب اور قدر دانوں کی خاطر سے پڑھنے پر راضی ہوتے تھے۔ خصوصاً جب ان سے پڑھنے کی درخواست کے ساتھ کوئی ایسی بات کہہ دی جاتی جس کا کچھ تعلق معتقدات سے ہوتا تھا۔ کلن صاحب کے منت ماننے کا ذکر آ چکا ہے۔ نواب علی جاہ والا جاہ نے بھی ان کو اسی تدبیر سے راضی کیا۔ انھوں نے کہا کہ لڑکیوں نے خواب دیکھا کہ آپ ہمارے یہاں مجلس پڑھ رہے ہیں اور نہایت ادب سے مجلس پڑھنے کی درخواست کی۔ دس تھیلیاں روپوں کی (ایک ہزار روپے) ساتھ لائے تھے۔ وہ نذر گزرائیں۔ بہ مشکل انیس راضی ہوئے اور ان کے یہاں تین مجلسیں پڑھیں۔

آرزو لکھنوی کے والد میر ذاکر حسین یاس بتاتے ہیں کہ یہاں کی مجلسوں میں انیس نے مرثیہ خوانی کے فن کا ایک انوکھا مظاہرہ کیا کہ ایک ہی مرثیے کو دو دن دو دفعہ پڑھا۔ پہلے دن ایک طرح اور دوسرے دن بالکل دوسری طرح۔

اسی زمانے میں نواب امجد علی خان کے یہاں بھی انیس نے مجلس پڑھی۔ یہاں بھی معتقدات درمیان آ گئے تھے۔ نواب کی بہو کربلا سے زیارت کر کے آئیں تو امجد علی خاں کچھ تبرّکات اور تحفے لے کر انیس کے پاس آئے اور کہا کہ آپ کی بہو یہ تبرکات لائی ہیں۔ انیس بہت خوش ہوئے۔ امجد علی خاں نے کہا حضور وہ منت مان کر آئی ہیں کہ لکھنؤ پہنچ کر مجلس کروں گی اور میر صاحب کو پڑھواؤں گی۔ انیس راضی ہو گئے۔ مجلس کے دن بہت مجمع ہو گیا۔

جیٹھ بیساکھ کا زمانہ تھا۔ دھوپ سخت پڑ رہی تھی۔ میدان میں نم گیروں کے نیچے مجلس تھی...... تمام شہزادگان اور رؤسا کا مجمع تھا۔ صراحیاں پانی کی چار جانب مجلس میں رکھوادی تھیں۔ پنکھے بے شمار لوگوں میں تقسیم کر دیے تھے۔ اس پر لوگ گرمی سے بے تاب تھے۔ میر انیس صاحب نے آ کر یہ رنگ دیکھا۔ منبر پر تشریف لے جا کر فوراً ایک رباعی نظم فرمائی:

دھوپ آتے ہی یاں پہ زرد ہو جاتی ہے
آندھی آتی ہے گرد ہو جاتی ہے
پنکھے آہوں کے آنسوؤں کا چھڑکاؤ
یاں گرم ہوا بھی سرد ہو جاتی ہے

اس مجلس میں بھی دہری خوانندگی ہوئی لیکن یہ عالی جاہ والا جاہ کے یہاں سے مختلف تھی۔ سید حسن رضا بتاتے ہیں:

''اس مجلس کا اندازہ آپ کو اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک مصرع جو میر انیس منبر پر پڑھتے تھے، اسی مصرع کو میر مونس صاحب، درمیان مجلس میں کھڑے تھے، وہ پڑھتے تھے تب تمام مجلس تک آواز جاتی تھی۔ اتنی بڑی مجلس کوئی نہیں ہوئی۔''

یہاں انیس نے مرثیہ ''جاتی ہے کس شکوہ سے رن میں خدا کی فوج'' پڑھا جس میں اس طرح کے بند ہیں:

اس شان سے فرس پہ شہہ انس و جن چڑھے   جس طرح نکلے ابر سے خورشید دن چڑھے
بہرِ جہاد راہِ خدا مطمئن چڑھے   گھوڑوں پہ نوجوانوں سے پہلے مُسِن چڑھے
سب جاں فشاں سوار تھے راہِ ثواب میں
پیدل مگر تھے ابن مظاہر رکاب میں
ابرو جھکے جو پڑتے تھے پلکوں پہ بار بار   رومال پھاڑ کر اُنھیں باندھا تھا اُستوار

آنکھوں سے شیرِ نر کی جلالت تھی آشکار گویا کہ تھی غلاف میں حیدر کی ذوالفقار
جلدی چلے جو چند قدم جُھوم جُھوم کے
رعشہ وداع ہو گیا ہاتھوں کو چُوم کے

....

لاشوں پہ لائیں بی بیاں زینب کو تھام کر ماتم کی صف پہ گر پڑی وہ سوختہ جگر
بولیں بڑھا کے دستِ مبارک اِدھر اُدھر بچے کدھر ہیں، مجھ کو کچھ آتا نہیں نظر
کیسی دھڑادھڑی ہے یہ کیوں بین ہوتے ہیں
لوگو نہ غل مچاؤ مرے لال سوتے ہیں

....

کہتا تھا باپ شب کو نہ بچے نکلنے پائیں بھولے ہیں راستہ نہ کہیں گھر کا بھول جائیں
دربار میں بھی ہوں تو سویرے سے گھر میں آئیں ہے ہے یہ دشتِ ظلم جو کرتا ہے سائیں سائیں
پہنچوں گی کس طرح میں جو ڈر ڈر کے روؤ گے
واری اندھیری قبر میں کس طرح سوؤ گے

سید تقی صاحب مجتہد کی سفارش پر انیس نے ترک کے بعد خوانندگی شروع کی تھی، لیکن خود اپنے یہاں انیس کو پڑھانے کے لیے مجتہد العصر نے انھیں یقین دلایا کہ میں مکان بند کر کے مجلس کروں گا اور مخصوص مجمع ہو گا لیکن اس مجلس کی کسی طرح لوگوں کو خبر ہو گئی۔ ''جوق جوق آنا شروع ہو گئے اور قبلہ و کعبہ کی محل سرا میں تل دھرنے کی جگہ نہ رہی۔ اس مجلس کی ایک خاص بات یہ تھی کہ اس کے لیے انیس نے نیا مرثیہ ''کیا عقدہ کشا خلق میں نام شہِ دیں ہے'' کہا اور اس میں بانی مجلس کی فرمائش پر معتوب فرشتے فطرس کی روایت نظم کی۔

اب جب انیس نے پھر سے پڑھنا شروع کر دیا تھا تو ان لوگوں نے بھی ان سے مجلس پڑھنے کی درخواست کی جن کے یہاں وہ ترک سے پہلے پڑھا کرتے تھے۔ ان میں داروغہ محمد خاں

بھی تھے۔'' وہ میر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے قدموں میں سر رکھ کر عرض کیا کہ حضور میری مجلس میں شرکت فرمائیں۔ میر صاحب نے صرف شرکت کا وعدہ کر لیا مگر جب مجلس میں گئے تو سارے مجمعے نے اتنی منت سماجت کی کہ میر صاحب مجبور ہو گئے۔ گھر سے بستہ منگوایا اور مجلس پڑھی۔'' داروغہ پہلے ہی سے یہ تہیہ اور بالا بالا اعلان کر چکے تھے کہ یہ مجلس انیس ہی سے پڑھوائی جائے گی۔ مجلس میں بے حد مجمع کی توقع تھی، چنانچہ مچان بنوائے گئے تھے۔ مجمعے کی وہ کثرت تھی کہ امام باڑے کی وسعت اور مچانوں کی گنجائش بھی کافی نہ ہوئی۔''

ان مجلسوں کے علاوہ بھی انیس نے کئی جگہ مجلسیں پڑھیں لیکن اب وہ پہلے کی طرح کثرت اور تواتر سے نہیں پڑھ رہے تھے، اور اتنی مجلسیں تو بالکل نہیں پڑھ رہے تھے جتنی اہلِ شہر ان سے سننا چاہتے تھے اسی لیے جب بھی انیس کی کسی مجلس کی خبر مشتہر ہوئی، لوگ اُنھیں سننے کے لیے دوڑ پڑتے تھے۔ یہ خبر کبھی کبھی غلط بھی ثابت ہوتی تھی اور کبھی کبھی بعض لوگ اپنے یہاں کی مجلس میں مجمع اکٹھا کرنے کے لیے یوں ہی اعلان کر دیتے تھے کہ یہ مجلس انیس پڑھ رہے ہیں۔

لکھنؤ میں ترکِ مرثیہ خوانی سے پہلے انیس اس شہر کی فضا، خصوصاً عزائی فضا پر چھائے ہوئے تھے لیکن آشوب اور ترک کے بعد لکھنؤ ان کے لیے بہت خوشگوار شہر نہیں رہ گیا تھا۔ اس لیے کہ اب یہ شہر کم از کم ان کے خیال میں ان کے قدر دانوں سے خالی ہو گیا تھا، جب انھوں نے یہاں پھر سے پڑھنا شروع کیا تو انھیں سننے کے لیے لوگوں کا اشتیاق بہت بڑھا ہوا تھا۔ یہ انیس کے لیے بڑی حوصلہ افزا بات تھی اور اس زمانے میں انیس نے اپنی غیر معمولی خوانندگی اور سامعین کے غیر معمولی مجمعوں کے لحاظ سے معرکے کی مجلسیں پڑھیں۔ عظیم آباد کی مجلسوں سے ان کو بہت کچھ مالی منفعت ہو چکی تھی اور اب لکھنؤ میں بھی اُن کے قدر دان امرا جو غیر یقینی معاشی صورتِ حال سے نکل آئے تھے، ان کو معقول نذرانے پیش کر رہے تھے۔ اس طرح لکھنؤ ایک بار پھر ان کا روزی رساں اور قدرداں شہر ہو گیا تھا اور خود انیس لکھنؤ کے اکابر کی صفِ اوّل میں آ گئے تھے۔ اسی کے ساتھ ان کی وہ شخصیت بھی اُبھر کر سامنے آ گئی تھی جس کا تعارف گذشتہ سطروں میں پیش کیا گیا۔

۱۸۶۴ء/ ۱۲۸۰ھ میں انیس ایک اور پریشانی میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں، وہ یہ کہ فیض آباد کا تمباکو جوان کے منھ کو لگا ہوا تھا اس کا ذخیرہ ان کے پاس ختم ہو گیا تھا اور وہ مجبوراً لکھنؤ کے تمباکو پر گزارا کر رہے تھے جس کی وجہ سے ان کے مزاج میں جھنجھلاہٹ سی آ گئی تھی۔ اس سلسلے میں نفیس نے مرزا غلام محمد کے نام، جو فیض آباد میں تھے، ۱۱ مارچ (۲ شوال) کو ایک خط میں لکھا:

''اور جناب والد ماجد آج تک تمباکو کی راہ دیکھتے ہیں۔ یقین تھا کہ قبل ماہِ رمضان کے ضرور بالضرور بھیجے گا۔ جب یہ مہینہ بھی آخر ہوا تو مجھ سے شکایت کی اور آزردہ خاطر ہوئے کہ مرزا غلام محمد صاحب ہمیں بالکل بھول گئے۔ ان سے یہ توقع نہ تھی۔ اب کبھی ان سے نہ منگواؤں گا بلکہ یہ کہا کہ اب نہ بھیجیں تو بہتر ہے۔ قریب سال بھر کے ہوا، کب [تک] انتظار کروں۔ لہٰذا لازم ہے کہ اسی مہینے میں ان کا تمباکو خشک تحفہ مول لے کے اور اپنے سامنے بنوا کے کسی مزدور کے ہاتھ برائے خدا بھجوا دیجیے کہ ان کا ملال رفع ہو۔''

رمضان میں روزے کے بعد بھی اپنا تمباکو پینے کو نہ ملنا اس ملال کا خاص سبب رہا ہوگا۔

....

۱۸۶۵ء (۱۲۸۱ھ) میں سید محمد افضل فارغ ستھا پوری انیس کے شاگرد ہوئے۔ فارغ نے اپنی شاگردی کا حال اس طرح بیان کیا ہے:

''جناب میر صاحب کی خدمت میں اکثر امرا و رؤسائے شہر موجود تھے جس وقت میں پہنچا، میر صاحب نے بہ دل میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ ...... اپنا کلام سناؤ ...... تا کہ تمھاری طبیعت کا انداز مجھے معلوم ہو جائے۔ چنانچہ حسب الحکم ان کے غزل کا ایک مطلع اور ایک شعر پڑھا۔ میر صاحب نے اپنے پاس سے ایک مرثیہ مجھ کو عطا فرمایا جس کا مطلع تھا ''یارب

ہمارے طبع کو اوجِ کمال دے' اور فرمایا کہ لو، اس کو پڑھو۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ اس وقت میر صاحب کا رعب وداب مجھ پر کس قدر غالب تھا۔ میری زبان گویا لال والکن ہوگئی تھی۔ مجھے مرثیہ نہیں سوجھتا تھا کہ اس میں کیا لکھا ہے...... سب جسم عرق میں تر ہو گیا تھا۔ تب میر صاحب نے نہایت دلاسا، تسلّی اور تشفّی فرمائی اور پہلے خود سیدھا سادھا پڑھا، پھر مجھے پڑھنے کی جرأت دلائی۔ خیر، بہ ہزار خرابی جب کسی قدر میرے ہوش درست ہوئے...... تب میں نے حسب الارشاد سر کو جھکا کر مرثیہ آگے رکھ لیا اور جس طرح کوئی بچہ مکتب میں ہل ہل کے سبق پڑھتا ہے اس طرح میں نے اس مرثیے کے مطلع کا بند پورا پڑھا۔ میرے اس طرح پڑھنے پر اہلِ مجلس تو اپنے اپنے منھ پر رومال رکھ کر مسکرانے لگے لیکن جناب میر صاحب نے دل بڑھانے کی غرض سے میری بہت کچھ تعریف کی اور فرمایا کہ انشاء اللہ تم بہت اچھا پڑھو گے۔ تم ہمارے پاس روز آیا کرو۔ چنانچہ میں ہر روز جناب میر صاحب کی خدمت میں جایا کرتا تھا اور ان سے مرثیہ پڑھا کرتا تھا۔"

فارغ کا سب سے طویل مرثیہ "شوکت نمائے فوجِ سخن ہے قلم مرا" ۲۵۷ بند تک پہنچ چکا تھا اور ان کی وفات کی وجہ سے ناتمام رہا۔

سیتاپور میں انیس کے ایک اور شاگرد سید ریاض الدین حسن ریاض تھے۔ جب انیس اُن کے یہاں مجلس پڑھنے سیتاپور جاتے تھے تو ان کے سفر کے لیے پالکی کی ڈاک کا انتظام کیا جاتا تھا۔

زید پور ضلع بارہ بنکی میں بھی انیس کے ایک شاگرد سید فضلِ علی وقار تھے۔ انیس وہاں مجلس پڑھنے گئے تھے، وہاں اپنی قیام گاہ پر لوگوں سے ملاقات کے دوران انیس دو تین گھنٹے تک جس انداز سے بیٹھے تھے اسی طرح بیٹھے رہے۔

۲۳ نومبر ۱۸۶۵ء (۴ رجب ۱۲۸۲ھ) کو انیس کے اس پوتے کی ولادت ہوئی جو مرثیہ گوئی اور اس سے زیادہ مرثیہ خوانی میں انیس کی روایت کا آخری امین ثابت ہوا۔ انیس کے فرزند نفیس کے یہاں چودہ لڑکے پیدا ہوئے لیکن ہر نومولود کی ناک اور کانوں سے خون بہنے لگتا اور وہ اس تولید خون کے عارضے میں ختم ہو جاتا تھا۔ اس بچے کی ولادت سے پہلے فیض آباد کے ایک

طبیب کی بتائی ہوئی تدبیریں اور احتیاطیں عمل میں لائی گئیں۔ ولادت کے وقت ایک چربی کا خول بچے کے بدن پر تھا جسے اتارنے کے بعد نہانی وغیرہ ہوا۔ انیس کے یہ پوتے سید خورشید حسین عروج تھے جنھوں نے اپنے عرف دولھا صاحب سے بہت شہرت پائی۔ وہ مرثیہ خوانی کے آخری ساحر نما استاد تھے۔ ان کے سوانح نگار سید حسن رضا کا بیان ہے کہ جب وہ چھوٹے سے تھے تو ان کو:

> ''میر انیس صاحب ہر وقت زانو پر بٹھائے رکھتے تھے اور پیار سے فرماتے تھے، ''ابے تو مرثیہ پڑھے گا؟'' یہ کہتے تھے، جی ہاں، پڑھوں گا۔ [انیس] فرماتے تھے کہ عورتوں کی بولیاں اور جانوروں کی بولیاں سیکھو۔''

☆☆............☆☆

دسواں باب

انیس کی آخری قیام گاہ

(چوبداری محلہ، سبزی منڈی، محلہ آئینہ سازاں، چوک)

راجا بازار کے بعد انیس نے جو مکان خریدا اس کا پتا چار طرح سے دیا جاتا ہے۔ اب یہ مکان چوک کے علاقے چوبداری محلّے میں پڑتا ہے۔ یہ شاہی آئینہ ساز گھسّن کا مکان تھا۔ اس سے متعلق ایک احاطہ بھی تھا جس کے ایک حصّے میں انیس نے اپنے لیے دیوان خانہ بنوالیا اور ایک حصّے میں نفیس نے اپنے صرف سے اپنا مکان بنوایا۔

وفات سے دو سال قبل انیس نے اپنے مکان کے قریب ہی ایک زمین خریدی اور میونسپل بورڈ سے اس زمین کو اپنا خاندانی قبرستان بنانے کا اجازت نامہ حاصل کرلیا۔

میر عشق کے بھتیجے اور انیس کے نواسے پیارے صاحب رشید اپنی ننہال اور ددیہال دونوں جگہ مقبول تھے اور ان کی وجہ سے دونوں خاندانوں کے روابط بڑھ گئے تھے لیکن شادی کی عمر کو پہنچ کر رشید ہی انیس اور عشق میں کشیدگی کا سبب بن گئے۔ میر عشق رشید کا عقد اپنی بیٹی کے ساتھ کرنا چاہتے تھے لیکن رشید کی والدہ نے ان کی شادی اپنے بھائی رئیس کی بیٹی سے کردی۔ اس بنا پر عورتوں میں کچھ ناچاقی ہوگئی جس کے نتیجے میں انیس اور عشق میں بھی رنجش ہوگئی۔ اسی رنجش کے زمانے میں ایک دن انیس نے اپنی صحبت میں عشق کے ذکر پر برافروختہ ہو کے کہا ''میں عشق کو خوب جانتا ہوں۔ ان کو پہلے ایک بات نکالنا، پھر رونا دھونا خوب آتا ہے:

عشق ہے تازہ کار تازہ خیال
ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال

کہیں آنسو کی یہ روایت ہے
کہیں یہ خونچکاں حکایت ہے

عماد الملک سید حسین بلگرامی ۱۸۶۷ء سے ۱۸۷۲ء تک (۱۲۸۳ھ - ۱۲۸۹ھ) کے کیننگ کالج (حال لکھنؤ یونیورسٹی) میں عربی کے مدرّس رہے۔ ان کے کاغذات میں یہ تحریر ملتی ہے:

> ''اس زمانے میں لکھنؤ کے اکابر علما، ادبا اور شعرا سے استفادے کا موقع ملتا رہا۔ مفتی میر عباس، مولانا میر حامد حسین صاحب مرحوم، مولانا علی محمد اور میر انیس سے فیضِ صحبت حاصل رہا۔''

حامد حسین بیرسٹر مولانا جسٹس کرامت حسین کی سوانح عمری میں لکھتے ہیں:

> ''ایسا انیسیہ میری نظر سے نہیں گزرا جیسے یہ دو صاحب، ایک مولانا (کرامت حسینؒ) اور ایک نواب عماد الملک سید حسن صاحب بلگرامی۔''

لکھنؤ میں ایک اور ترکِ مرثیہ خوانی

معرکۂ انیس و دبیر کا تفصیلی جائزہ اسی نام کی کتاب میں لیا جا چکا ہے۔ اب انیسیوں دبیریوں کا تنازعہ ادب کے حدود سے تجاوز کرنے لگا تھا۔ میر نواب علی کا بیان ہے کہ اس معرکے نے اتنی ناگوار صورت اختیار کر لی تھی کہ انیس نے دل برداشتہ ہو کر لکھنؤ میں مرثیہ پڑھنا چھوڑ دیا۔

یہ ترک تخمیناً ۶۷-۱۸۶۶ء (۱۲۸۳ھ) سے شروع ہوا۔ انیس نے ترک کا سبب اپنی بیماری کو بتایا ہے۔ انھوں نے حکیم سید علی کے نام خط میں لکھا کہ اس عرصے میں میرا شغلِ خواندگی ''یک قلم ترک'' رہا۔

اودھ اخبار نے اپنے اپریل ۱۸۷۰ء (محرم ۱۲۸۷ھ) کے شمارے میں لکھا:

> ''ہم کو نہایت افسوس ہے کہ میر صاحب نے مرثیہ پڑھنا ترک فرمایا ہے اور شاید تصنیف فرمانا بھی چھوڑ دیا ہے۔ غیر ملکوں کے آدمی جو لکھنؤ میں

وارد ہوتے ہیں بیشتر حسرت وافسوس سے کہتے ہیں کہ ہم نے میر صاحب کو نہیں سنا۔''

فروری ۱۸۷۱ء (ذوالحجہ ۱۲۸۷ھ) میں شریف العلما نے حیدرآباد میں انیس کی مرثیہ خوانی طے ہو جانے کی خبر دیتے ہوئے لکھا:

''جو لطف اہلِ لکھنؤ کو میسر نہیں وہ یہاں ہوگا۔''

حیدرآباد پہنچنے کے بعد انیس نے شریف العلما کو بتایا کہ میں نے عرصے سے مرثیہ کہنا ترک کر دیا ہے، اور پڑھنا بھی چھوڑ دیا ہے۔

گویا اس بار انیس کا غصہ صرف لکھنؤ پر نہیں، اپنے آپ پر بھی اُترا اور انھوں نے مرثیہ خوانی کے ساتھ مرثیہ گوئی بھی ترک کر دی۔

حیدرآباد میں مجلسیں پڑھ کر اور وہاں سے واپسی کے راستے میں کچھ اور مجلسیں پڑھتے ہوئے انیس لکھنؤ پہنچے۔ اس عرصے میں بھی یہ شہر ان کی خوانندگی سے محروم رہا۔ انیس نے ترک کا سبب اپنی طویل علالت کو بتایا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ وہ علالت کا عذر کر کے مرثیہ پڑھنے سے انکار کر دیتے ہوں اور اس انکار کا سبب کچھ ان کی طبیعت کی خرابی اور بہت کچھ ان کی طبیعت کی بدمزگی ہو۔ ''یک قلم ترک'' کا مطلب بھی نہ سمجھنا چاہیے کہ اس پانچ چھ سال کے عرصے میں انھوں نے سرے سے کوئی مجلس پڑھی ہی نہ ہو۔ یہ ممکن ہے کہ انھوں نے سال عام اور مجمعِ عام والی کھلی ہوئی مجلسیں پڑھنا چھوڑ رکھی ہوں لیکن مخصوص سامعین کے محدود مجمعے میں کوئی کوئی مجلس پڑھ دیتے ہوں۔

۱۸۶۸ء (۱۲۸۴ھ) میں انیس نے بیگم جان کی وفات کی تاریخ کہی جو غالباً مونس کی خوش دامن تھیں۔ انیس کے قریبی دوست علی اوسط رشک بھی اسی سال کربلائے معلیٰ میں وفات پا گئے۔ اگلے سال انیس کے قدردان نواب مرزا عالی جاہ زیارت کے سفر کو جاتے ہوئے بمبئی پہنچ کر فوت ہو گئے۔

۱۸۶۹ء (۱۲۸۵ھ) غالب کا سالِ وفات ہے۔ غالب اپنے مذہبی ترجیحات، محبّ

اہل بیت، خصوصاً حضرت علیؑ سے غیر معمولی عقیدت کی بنا پر لکھنؤ کے شیعی حلقوں میں مقبول تھے۔
انیس کے کاغذات میں غالب کی وفات پر یہ رباعی پائی گئی ہے۔

گلزارِ جہاں سے باغِ جنت میں گئے
مرحوم ہوئے جوارِ رحمت میں گئے
مدّاحِ علیؑ کا مرتبہ اعلیٰ ہے
غالبؔ اسد اللہ کی خدمت میں گئے

اس انداز کی تعزیتی رباعیاں مرثیہ گو شعرا ان مجلسوں میں پڑھتے تھے جو کسی کے ایصال ثواب کے لیے ہوتی تھیں۔ اگر یہ رباعی انیس ہی کی ہے تو سمجھا جا سکتا ہے کہ انھوں نے غالب کے ایصال ثواب کی کوئی مجلس پڑھی تھی، اگرچہ یہ ان کے ترک خوانندگی کا زمانہ تھا۔

۱۸۶۹ء (۱۲۸۶ھ) ہی میں انیس کے محسن دیانت الدولہ بھی وفات پا گئے اور انھی چند برسوں میں انیس کے ایک اور قدر دان ارسطو جاہ کی بھی وفات ہو گئی۔

۱۸۷۰ء (۱۲۷۸ھ) میں حکیم سید علی کی والدہ سلیمہ بی بی کا انتقال ہوا۔ انیس نے ان کی تعزیت میں حکیم صاحب کو خاصی انشا پردازانہ فارسی میں خط لکھا جس کے کچھ جملوں کا اردو قالب حسبِ ذیل ہے:

''کیا کہوں اور کیا لکھوں کہ غم سے میرا کیا حال ہو رہا ہے۔ کبھی ان مرحوم و مغفورہ کی بزرگانہ شفقتوں کا خیال رلاتا ہے تو کبھی پس ماندگان کی صورت سے دل حسرت کی آگ میں جلنے لگتا ہے۔ غدّار زمانے کی نیرنگیوں سے فریاد کہ کسی ذی حیات کو دم مارنے اور سانس درست کرنے کی مہلت نہیں ہے۔ میرے دل پر اس وقت جو گزر رہی ہے خدا اس سے واقف ہے کہ میں بھی اس روح فرسا غم کا مزہ چکھے ہوئے ہوں۔ اس سانحۂ جاں کاہ میں خود پہنچ کر شریک ماتم نہ ہونے کا صدمہ مزید ہے۔ آپ کو کچھ لکھنا گویا

لقمان کو حکمت پڑھانا ہے۔ رضائے الٰہی کے پابند رہیے کہ یہ دنیا گذشتنی اور گذاشتنی ہے۔ سید صادق صاحب کی حالت کے تصور سے آنکھ گریاں اور دل کباب ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ بیمار ہیں۔ اس صورت میں ان کا یہاں میرے پاس آ جانا ضروری ہے اور اُن کا علاج بھی یہیں مناسب ہوگا۔ آئندہ جو آپ کی صلاح وہی ہم سب کی صلاح۔''

وثیقہ نجف کا قضیہ

انیس کے اس بار کے ترکِ خوانندگی کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ایک بار پھر معاش کی تنگی میں مبتلا ہو گئے۔ ۵۷ء کے بعد ان کی بندھی ہوئی آمدنی کے دو ذریعے رہ گئے تھے۔ ایک تو وہی سرکارِ انگریزی کا پندرہ روپے کا وظیفہ اور دوسرا شاہ نجف کے وقف کا چالیس روپے ماہوار وثیقہ۔ یہ وثیقہ بھی ناگوار حالات میں بند ہو گیا۔ وقفِ نجف کے متولّی حکیم بندہ مہدی تھے۔ مانوس کا بیان ہے:

''انھوں نے ایک مجلس میں انیس کی ''خوانندگی کا اعلان بلا استمزاج کر دیا اور بہت مصر ہوئے مگر (انیس) نہ پڑھے۔ انھوں نے چالیس روپے ماہوار...... جو مبارک محل کے یہاں سے نجف کی طرف سے ملتے تھے، وہ بند کر دیے۔ میر صاحب نے اس کو سن کر فرمایا کہ انیس کی جوتی کے چالیس ستارے جھڑ گئے۔ کچھ دن بعد حکیم صاحب بیمار پڑے۔ مرنے سے بہت ڈرتے تھے۔ لوگوں نے کہا کہ آپ نے سادات پر ظلم کیا ہے اور ان کا وظیفہ بند کر دیا ہے۔ آپ کا مرض اسی کا خمیازہ ہے۔ انھوں نے انیس کا وظیفہ جاری کرنا چاہا مگر اِنھوں نے انکار کر دیا۔''

احسن خفیف سے فرق کے ساتھ یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ایک مدّت کے بعد حکیم بندہ مہدی نے وثیقہ پھر سے جاری کرنے کی پیشکش کی تو انیس نے کہلا بھیجا کہ بندہ مہدی پہلے ''من ابتدائے موقوفی تا تاریخ اجرا'' چڑھی ہوئی رقم ادا کریں، پھر وثیقہ جاری کریں۔

رقم زیادہ ہوتی تھی اس لیے انیس کی یہ شرط منظور نہیں ہوئی۔ انیس کی وفات کے بعد یہ تنخواہ نفیس پر بحال کرنے کی سلسلہ جنبانی ہوئی تھی، لیکن نفیس نے بھی یہی شرط لگا کر انکار کر دیا۔

شریف العلما نے بھی اس وثیقے کے بند ہونے کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ لکھنؤ میں اس کے دن بہت برے گزر رہے ہیں۔ انگریزی وظیفے کے سوا کہیں سے آمدنی کی کوئی سبیل نہیں۔ بہ درجۂ مجبوری سفر اختیار کیا ہے۔ ورنہ وہ سفر کرنے کی حالت میں نہیں ہیں۔

اس بے حالتی میں انیس نے جو سفر اختیار کیا وہ شمالی ہندوستان سے جنوبی ہندوستان تک حیدرآباد دکن کا طول وطویل سفر تھا۔

حیدرآباد کا سفر

حیدرآباد کے نواب تہور جنگ کے یہاں میر محمد زکی بلگرامی محرم کی مجلسیں پڑھتے تھے۔ ایک بار وہ رخصت لے کر وطن گئے اور پھر ان کی کوئی خیر خبر نہیں ملی تو ان کی جگہ کسی اور ذاکر کی تلاش ہوئی۔ اس زمانے میں ارسطو جاہ کے بیٹے شریف العلما سید شریف حسین خان حیدرآباد میں ناظم عدالت تھے۔ ان کی تحریک پر لکھنؤ کے مشہور عالمِ دین شمس العلما مولوی حامد حسین کی معرفت انیس کو مدعو کیا گیا۔ تین ہزار نذرانے کی پیش کش ہوئی جو انیس نے غالباً اس لیے نامنظور کر دی کہ عظیم آباد میں ان کو اس سے زیادہ نذرانہ ملتا تھا۔ اب تہور جنگ نے رقم بڑھا کر چار ہزار کر دی۔ انیس نے آنا منظور کر لیا۔ شریف العلما نے لکھا کہ تمام شہر میں شہرہ ہو گیا ہے کہ میر انیس تشریف لا رہے ہیں۔ پھر بتاتے ہیں کہ مجلسوں کے لیے بڑی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ چاندنیوں، شامیانوں کا انتظام کیا جا رہا ہے اور مکانوں پر سفیدی ہو رہی ہے۔

حیدرآباد میں انیس کی آمد کی شہرت کے ساتھ ان کی نازک مزاجی کی بھی شہرت ہو رہی تھی۔ ریاست کے مدار المہام مختار الملک نے تہور جنگ سے کہا کہ سنا ہے میر انیس صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ وہ بہت معقول آدمی اور انتہائی نازک مزاج ہیں۔ ان کی مہمان داری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جائے، نہ کوئی امر خلافِ احتیاط عمل میں آئے۔

۲ مارچ ۱۸۷۰ء (۱۰ ذوالحجہ ۱۲۸۷ھ) کو انیس لکھنؤ سے روانہ ہو گئے۔ ان کے ساتھ ان کے دو بیٹے رئیس اور سلیس) دونوں سید علی حسین اور شیخ نجف علی اور دو اور آدمی تھے۔

اس وقت ریل حیدر آباد کے بجائے صرف گلبرگہ تک جاتی تھی۔ منازلِ سفر یہ تھے: کان پور، الہ آباد، جبل پور، اٹارسی، کھنڈوا، برہان پور، بھسا دل، ناسک، کلیان، پونا، شولا پور، گلبرگہ، حیدر آباد کے مسافروں کو گلبرگہ پر اتر کر دوسرے ذریعوں سے حیدر آباد پہنچنا ہوتا تھا۔

مونس کے نام اپنے خط میں (جو حیدر آباد سے ۱۳ محرم ۱۲۸۸ھ کو لکھا گیا) انیس بتاتے ہیں کہ نواب تہور جنگ نے اپنے عزیزوں اور دوسرے امرا کے ساتھ حسین ساگر تک آ کر میرا استقبال کیا اور جو یہاں کی مہمان داری کا حق ہے اس میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کر رہے ہیں۔

انیس کی خاطر تواضع کے فرائض شریف العلما کے ذمے تھے اور وہ ہر دوسرے تیسرے دن اپنے بھائی سید شریف حسن خاں کو خط لکھ کر انیس اور مجالس وغیرہ کے بارے میں انھیں بتاتے رہتے تھے۔

حیدر آباد پہنچنے کے دوسرے ہی دن سے انیس کو تیز بخار اور کھانسی نزلہ ہو گیا تھا لیکن ان سے ملنے والوں کا ہجوم رہتا تھا اور وہ ان کو اپنی خوش گفتاری سے موہ رہے تھے، اور اپنی بیماری کو زیادہ ظاہر نہیں کر رہے تھے۔ ۲۵ ذوالحجہ کے خط میں جب انیس کی طبیعت کی خرابی کو ایک ہفتہ ہو رہا تھا، شریف العلما نے دوسرے اذکار کے ساتھ سرسری طور پر یہ بھی لکھا کہ یہاں پہنچ کر انیس کو اختلاف آب و ہوا کی وجہ سے کھانسی ہو گئی ہے لیکن ۲۹ ذالحجہ کو لکھتے ہیں:

> ''لیکن وہ بیمار ہو گئے ہیں۔ نہیں معلوم کتنے دن میں مرثیہ پڑھنے کا اتفاق ہوتا ہے۔''

اور اسی خط کے آخر میں لکھتے ہیں:

> ''میر انیس کو شدّت سے بخار ہے۔ حق تعالیٰ شفا دے۔''

اس وقت انیس کو انگریزی علاج پر آمادہ کیا گیا۔ ڈاکٹر کی دوا سے ان کو پسینہ آ کر بخار

اتر گیا لیکن کمزوری بے حد تھی۔ تہور جنگ کی پریشانی بہت بڑھی ہوئی تھی۔ انیس لکھتے ہیں:

''پہلی تاریخ پانچ ہزار آدمی جمع ہو گئے تھے۔ تہور جنگ نے میرے پاس آ کر کہا اگر آپ میں طاقت ہو تو مجلس میں شریک ہو جایئے کہ اس کی برکت سے مرض میں تخفیف ہو جائے۔ میں عجب حالِ زار سے مجلس میں پہنچا۔ میر محمد (سلیس) سے پڑھنے کو کہا۔ وہ چند بند پڑھ کر اتر آئے۔ میں اسی حال میں اٹھا۔ منبر پر جا کر چند بند دھیرے دھیرے پڑھے۔ فقط سیدالشہدا کی تائید تھی کہ مجلس کا حال دگرگوں ہو گیا۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ لکھنؤ میں پڑھ رہا ہوں۔ پڑھ چکا تو ساری مجلس میرے قدموں پر گر پڑی۔''

اس پہلی مجلس میں انیس نے تھوڑے ہی سے بند پڑے تھے لیکن ان کے کلام اور خوانندگی کا سکّہ دلوں پر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد یہ معمول ہو گیا کہ صبح ان کو بخار اترنے کی دوا دی جاتی اور وہ مجلس پڑھنے کے قابل ہو جاتے۔ سہ پہر سے بخار چڑھتا اور رات کو انھیں خواب آور دوا دے کر سلا دیا جاتا تھا۔ انیس ہر مجلس میں بندوں کی تعداد بڑھاتے جاتے تھے۔ نویں کی مجلس میں انھوں نے ۱۶۸ بند کا مرثیہ ''جب خاتمہ بہ خیر ہوا فوج شاہ کا'' تقریباً پورا پڑھ دیا۔ اس تاریخ کو ان کی خوانندگی ایک یادگار واقعہ قرار پائی۔ خود انیس نے مونس کو کہا:

''اور نویں کی مجلس کا حال تو کیا لکھوں۔ افسوس تمھاری جگہ خالی تھی۔''

شریف العلما نے بھی ''علی الخصوص مجلسِ نہم'' کی بہت تعریف کی ہے۔

انیس حیدرآباد میں ۱۵، اپریل ۱۸۷۱ء (۲۴ محرم ۱۲۸۸ھ) تک رہے۔ مختار الملک نے بھی ایک مجلس کرنے کا ارادہ کیا تھا اور انیس سے ملنے کی بھی خواہش کی تھی لیکن انیس نے کمزوری اور کھانسی کا عذر کر دیا۔ انیس کے سامنے مختار الملک کا ذکر کچھ اس طرح کیا گیا تھا کہ انھوں نے لکھا:

''یہ ناچاری کا توقف اس سبب سے ہوا ہے کہ مختار الملک بہادر مجلس کرنے

کا قصد رکھتے ہیں لیکن میں نے کم زوری اور کھانسی کی وجہ سے، جواب بھی بہت آ رہی ہے، قطعی انکار کر دیا ہے۔ اب وہ کہتے ہیں کہ مجھ سے ملاقات کر کے جائیے اور خود ہی دربار میں یہ کہتے ہیں کہ مجھ کو ان کا اس شہر سے جانا قبول نہیں ہے۔ میں یہ خبریں سن سن کر لرز رہا ہوں کہ وہ حاکم آدمی ہے......بس اتنا چاہتا ہوں کہ اس شہر سے زندہ نکل جاؤں۔''

روانگی سے پہلے تہور جنگ نے ڈاکٹر کے مشورے پر انیس کو حیدر آباد کے ایک رئیس ٹیپو صاحب کے باغ میں ٹھہرایا جو شہر اور کوہِ مولا علیؑ کے درمیان واقع تھا اور وہیں سے ان کی روانگی ہوئی۔

حیدر آباد کی مجلسوں کا نذرانہ چار ہزار روپے طے ہوا تھا اور اس رقم میں سفر خرچ بھی شامل تھا، لیکن تہور جنگ نے انھیں ساڑھے پانچ ہزار روپے دیئے اور پانچ سو روپے کا دوشالہ بھی دیا۔ ٹیپو صاحب نے رخصت کے وقت ان کے بازو پر پانچ سو روپے کی اشرفیاں باندھیں۔ اُنھیں الوداع کہنے کو بہت لوگ آئے تھے، انھوں نے بھی حسبِ استطاعت ان کو نذرانے پیش کیے۔ اس طرح حیدر آباد سے ان کو اتنی آمدنی ہوگئی کہ ان کی زندگی کے بقیہ چار سال مالی تنگی کے بغیر گزرے۔

حیدر آباد سے واپسی پر انیس نے الہ آباد میں وہ مجلس پڑھی جسے سن کر ذکاءاللہ مبہوت ہو کر رہ گئے۔

اُنس سے بگاڑ

انس سے انیس کی نااتفاقی کا تذکرہ آ چکا ہے۔ آخری برسوں میں یہ نااتفاقی بڑھ گئی تھی۔ ۱۸۷۰ء (۱۲۸۷ھ) کے ایک خط میں انیس لکھتے ہیں:

''مجھ کو وقائع نویسی اور افسانہ سنجی کی عادت نہیں۔ فقط اتنا کہنا کافی ہے کہ جس دن سید صادق صاحب یہاں سے جا رہے تھے بس اسی دن اور وہیں ''برادر مہربان'' سے ملاقات ہوئی۔ سید صادق صاحب کے پاس خاطر

سے طبیعت پر جو جبر کیا وہ کیا۔ ظاہرا اب میرے مرثیے شاید نہیں پڑھتے۔
میر نواب (مونس) کے مرثیے البتہ پڑھتے ہیں۔ یہ اجمال ہے، تفصیل
انشاءاللہ اگر موت نے مہلت دی تو بروقتِ ملاقات۔ آئندہ فقیر تابع ارشاد
ہے جو آپ فرمائیں گے وہ عمل میں آئے گا۔''

ان فقروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں انیس انس سے ملاقات ترک کیے ہوئے تھے۔ سید صادق کی وجہ سے ان کو انس کے یہاں (جہاں سید صادق ٹھہرے ہوئے تھے) جانا پڑا۔ انیس کو شبہ تھا کہ انس ان کی لمبی چوڑی، جھوٹی سچی شکایتیں حکیم سید علی سے کرتے رہتے تھے۔

اس کے بعد ایسے واقعات پیش آتے رہے جس نے دونوں بھائیوں کی رنجش اور بڑھا دی اور اس کا سلسلہ انیس کی زندگی کے آخری مہینے میں ختم ہوا۔

☆☆..........☆☆

گیارھواں باب

زندگی کے آخری سال

انیس کی عکسی تصویر

اب ہندوستان میں فوٹوگرافی کا فن شروع ہو چکا تھا۔ انیس کے مدّاحوں کی خواہش تھی کہ ان کی عکسی تصویر اتروالی جائے۔ انیس نے شروع میں انکار کیا لیکن آخر راضی ہو گئے اور لکھنؤ کے فوٹوگرافر مشکور الدولہ حیدر جان اپنا فوٹو کھینچنے کا سامان لے کر انیس کے گھر پر آئے اور تصویر کھینچی گئی۔ اس تصویر سے بڑی روغنی نقلیں تیار کی گئیں لیکن وہ باقی نہیں رہیں۔ اصل تصویر دھندلی پڑ گئی ہے لیکن ذخیرۂ ادیب میں موجود ہے۔

اسی زمانے میں انیس نے اپنے ایک دوست میر اشرف مسیح کی سفارش میں حکیم سید علی کو ایک خط لکھا کہ ان کی لڑکی بنارس میں بیاہی ہوئی تھی۔ شوہر کی وفات کے بعد اس کے سسرال والے اسے لکھنؤ نہیں آنے دے رہے ہیں اور طرح طرح کی تکلیفیں پہنچا رہے ہیں۔ امید ہے کہ آپ ان کی زبانی پوری کیفیت سن کر ان کی مدد کریں گے اور فقیر کی جانب سے تقدس مآب مولوی گلشن علی صاحب کی خدمت میں عرض کریں گے کہ جنابِ والا بھی ان کے مدد معاون ہوں اور ان کی بیٹی کو سسرال والوں سے مخلصی دلانے میں سعی فرمائیں۔

مولوی گلشن علی ریاست بنارس کے دیوان اور ممتاز عالمِ دین ہونے کی وجہ سے بڑے صاحبِ اقتدار تھے۔ انیس کا ان کو براہِ راست سفارش کا خط لکھنے کے بجائے حکیم سید علی کے ذریعے سفارش کہلا دینے پر اکتفا کرنا بتاتا ہے کہ ان کے لیے انیس کی بالواسطہ سفارش بھی وزن رکھتی تھی۔

اس سفارشی خط کے اگلے مہینے انیس کے قدر دان نواب علی نقی خاں کی وفات ہوگئی۔ پھر ان کے دو اور قدر دان نواب والا جاہ اور ۲۶ نومبر ۱۸۷۲ء (۲۴ رمضان ۱۲۸۹ھ) کو ممتاز العلما سید تقی صاحب کی وفات ہوگئی اور ان کے فوٹو گرافر مشکور الدولہ بھی ختم ہوگئے۔

مدرسۂ ایمانیہ کے طلبہ اور انیس

۷۳-۱۸۷۲ء (۱۲۸۹ھ) میں لکھنؤ میں مدرسۂ ایمانیہ قائم ہوا۔ یہ انیس کے مکان کے قریب ہی ممتاز العلما کے امام باڑے میں تھا۔ علامہ غلام حسنین کنتوری اس کے مہتمم اور مدرس تھے۔ اس وقت معرکۂ انیس و دبیر شدّت پر تھا اور دینی مدارس تک انیس کی گرمی پہنچ رہی تھی۔ علامہ کنتوری اپنی سوانح عمری ''لائف'' میں بتاتے ہیں کہ مدرسے کے سب طلبہ انیسیے تھے، صرف ایک لڑکا محمد مہدی نصیر آبادی دبیریہ تھا۔ دوسرے لڑکے اس سے بحث کرتے رہتے تھے۔ ایک دن وہ روتا ہوا میرے پاس آیا اور لڑکوں کی شکایت کرنے لگا۔ میں نے اس کو میر انیس کے دو شعر بتائے:

جب قتل کی شب سبط نبیؑ کو خبر آئی
اے چاند ید اللہ کے شبِ دوپہر آئی

یہ جھریاں نہیں ہاتھوں پہ ضعفِ پیری ہے
چنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو

اور کہا کہ ان لڑکوں سے پوچھو کہ یہ خبر کہاں سے آئی؟ رات کا ہونا ہر شخص محسوس کر سکتا ہے۔ اس کی خبر دینے کی کیا ضرورت تھی؟ دوسرے یہ کہ ''آستین کا چنوانا زینت کے واسطے ہوتا ہے اور جھریاں پڑنے سے آدمی کے بدن کی زینت جاتی رہتی ہے۔ پس یہ تشبیہ بہ طور مدح کے ہے یا بہ طور ذم کے؟ میری غرض انیس پر اعتراض کی نہ تھی بلکہ ان اطفال کو...... علم معانی و بیان جوان کو پڑھنا ضرور تھا، اس کی جگہ بہ قولِ مُشیر:

جھگڑا بکر کا ہے نہ جنابِ امیرؑ کا
اب قصہ رہ گیا ہے انیس و دبیر کا

[تنبیہ کرنا مقصود تھا] خلاصہ، محمد مہدی نے یہی دو شعر پیش کر کے زور و شور سے بحث کی۔ وہ جماعت چونکہ ابھی قواعدِ بلاغت سے واقف نہ تھی، جواب سے عاجز ہو کر بہ خدمت میر انیس گئے''۔ انیس کو ان لڑکوں کا اپنا معتقد ہونا معلوم تھا۔ انھوں نے ان کو بلا کر بٹھایا اور ''بے وقت'' آنے کا سبب دریافت کیا۔ طلبہ نے پورا قصہ بیان کیا۔ ''میر صاحب کو ان کا کلام صحیح نہ معلوم ہوا بلکہ الٹا سمجھے کہ یہ لڑکے خود مجھ پر اعتراض کرنے کو آئے ہیں۔ نہایت برہم ہو کر سب کو اپنے پاس سے دور ہونے کا حکم دیا...... وہ لڑکے محجوب ہو کر واپس آئے...... اور وہ بحثِ بے جا بالکل اٹھ گئی اور ہماری غرض صرف اسی قدر تھی۔''

تپ وبائی ۷۳-۱۸۷۲ء/۱۲۸۹ھ

یہ لکھنؤ بلکہ پورے ہندوستان میں تپ وبائی کا سال تھا۔ انس کا پورا خاندان، انیس کا پورا خاندان مع انیس اس میں مبتلا ہوا۔ عتباتِ عالیات تک یہ وبا پہنچ گئی تھی جہاں اس زمانے میں نواب امجد علی خاں زیارات کو گئے ہوئے تھے۔ ان کے قافلے کے کئی لوگ اس کی بھینٹ چڑھ گئے۔ ان میں نواب کے خسر محمد تقی خان اختر بھی تھے جن کا بے نقط مرثیہ ''ہم طالعِ ہما مرادِ ہم رسا ہوا'' مشہور ہے۔ یہ وبا ادب کا بھی موضوع بن گئی تھی۔ شجاع الدولہ کے پڑپوتے اور پُر گو مرثیہ نگار نواب باقر علی خاں تشفی کی رباعی ہے:

اے گردشِ چرخ کیوں پریشاں کی ہوا
کیوں مختلف و بے سروساماں کی ہوا
کیا ڈر ہے وبا سے کہ ہے یاں خاکِ شفا
گو بد ہو ہوا کافی ہے قرآں کی ہوا

اس تپ نے انیس کی ٹوٹی ہوئی صحت کو اور توڑ کر رکھ دیا۔

آخری برسوں کی مرثیہ گوئی اور مجلسیں

مانوس کا بیان ہے کہ آخر زمانے میں انیس نے ''ایک مرتبہ ساٹھ ستر بند نظم کیے۔ حضرت سجاد کی بیماری کے بیان میں۔ مگر اس [مرثیے] کے تمام ہونے سے پہلے خود تمام ہو گئے۔ وہ مرثیہ ضائع ہو گیا۔''

انیس کی وفات سے دو سال قبل ان کا ایک ''نوتصنیف'' مرثیہ جنابِ سکینہ کی وفات کے حال کا نقل ہوا۔ اس مرثیے میں سیّد سجاد امام زین العابدین علی ابن الحسینؑ کی بیماری کا بھی ذکر ہے، مثلاً:

غش میں ہیں بے خبر پہ کسی کو نہیں خبر تبرید کون دے کہ ذرا سرد ہو جگر
شدّت سے تپ کی سر کو پٹکتے ہیں رات بھر صندل رگڑ کے لائے یہ کس کو ہے دردِ سر
منھ سرخ ہے یہ اپنی مصیبت کو روئے ہیں
یاں سونا کیسا جان سے ہاتھوں کو دھوئے ہیں

شدّت تپ دروں کی ہے منھ کیوں نہ تمتمائے یہ رنگ ہے کہ سونے کو جیسے کوئی تپائے
کروٹ جو لیں تو پاؤں کی زنجیر غل مچائے بولیں جو کچھ تو حلقۂ آہن گلا دبائے
ہمت کو مثلِ جدّ و پدر ہارتے نہیں
دم پر بنی ہوئی ہے پہ دم مارتے نہیں

اسی زمانے میں حکیم سید علی نے انیس کے پڑھنے کی مجلس کا منصوبہ بنایا تو مونس نے انھیں لکھا:

''سابق سے اب تک جناب میر صاحب قبلہ کے پڑھنے کی کسی نے غلط خبر دی ہے۔ آپ کے جانے کے بعد سے اس وقت تک وہ کہیں بھی نہیں پڑھے ہیں، نہ فی الحال کسی سے وعدہ ہے...... اگر آپ میر صاحب قبلہ سے حتمی وعدہ لے لیں اور وہ اشتہار وغیرہ کی اجازت دیں تب تو مجلس کے

مہینے، تاریخ وغیرہ کا اعلان ہو ورنہ مضحکہ کا موجب ہوگا اس لیے کہ ان کی درستی مزاج کا ہفتے بھر کے لیے بھی بھروسا نہیں ہے۔''

اس آخر زمانے میں انیس زیادہ تر مرثیے کا کوئی ایک جز یا کچھ اجزا پڑھ کر اور بین سے ربط دے کر اتر آتے تھے لیکن ان مختصر خواندگیوں میں بھی اپنا کمال دکھا دیتے تھے۔ ایسی ہی ایک مجلس کا بیان مونس کرتے ہیں:

''۲۸ [رجب] کو یہاں جناب بھائی صاحب کے پڑھنے کی مجلس مقرر ہو گئی.......... مجمع بہت تھا۔ ممدوح نے جناب سید الشہدا کی رخصت کا مرثیہ چند رزمیہ بندوں تک پڑھا۔ کم زوری کے سبب پورا نہیں پڑھا، مگر سبحان اللہ! ضعیفی میں بھی عالم جوانی اور وہی ''حسنِ کمالِ مرثیہ خوانی'' تھا۔

غالباً اسی سال انیس آغا میر کے داماد نواب علی حسین خاں عرف نواب دولھا کے یہاں مجلس پڑھنے دو گھوڑوں کی گاڑی پر کان پور گئے۔ وہاں انھوں نے دبیر کے بارے میں یہ رائے دی:

''مرزا کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے مرثیہ گوئی کے فن کو اپنی ذات سے حاصل کیا اور اپنی ہی ذات پر ختم کر دیا۔ میں نے اگر کہا تو کیا کمال کیا کہ میرا تو یہ خاندانی فن تھا۔''

کان پور میں انیس کے پڑھنے کے لیے نواب دولھا نے خاص طور پر منبر بنوایا تھا جو ان کے امام باڑے (واقعِ رام نرائن کے بازار) میں موجود ہے۔

انیس کی آخری مجلس کے بارے میں مختلف بیان ملتے ہیں۔ مثلاً (اشہری بتاتے ہیں کہ انھوں نے امجد علی خاں کے یہاں آخری بڑی مجلس پڑھی۔ نواب مغفور جاہ عرف چھوٹے آغا صاحب (فرزندِ آغا ابو صاحب) کا بیان ہے کہ آغا ابو صاحب کی فرمائش پر انیس نے انکار کر دیا مگر انھوں نے کہا کہ ہمارے ہی یہاں سے آپ نے مرثیہ پڑھنا شروع کیا تھا لہٰذا ہمارے ہی یہاں پر ختم بھی کیجیے۔ ان کا اشارہ مرزا سیدو صاحب کے یہاں فیض آباد میں انیس کی مرثیہ خوانی

کی طرف تھا۔ انیس راہی ہو گئے اور پورا عشرہ پڑھے۔ مانوس وغیرہ نے بتایا کہ ۱۳ اپریل ۱۸۷۴ء/ ۱۵ صفر ۱۲۹۱ھ کو انیس نے شیخ علی عباس کے مکان کنکر کنویں پر آخری نیا مرثیہ پڑھا۔

ان بیانوں میں ''آخری'' کے مختلف مفاہیم کو پیشِ نظر رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ انیس نے آخری ''بڑی'' مجلس شیش محل میں نواب امجد علی خاں کے یہاں پڑھی، آخری عشرہ مجلس ترمنی گنج میں آغا ابو صاحب کے یہاں اور اپنی آخری مجلس کنکر کنویں پر شیخ علی عباس کے یہاں پڑھی۔

انیس اور اشہری و احسن

انیس کی زندگی کے انہی آخری برسوں میں اُنھیں ان کے مستقبل کے سوانح نگاروں امجد علی اشہری اور مہدی حسن احسن نے دیکھا۔ اشہری اپنی کتاب ''ایشیائی شاعری'' میں بتاتے ہیں:

''میں نے میر انیس غفراں مآب کو دو مرتبہ دیکھا اور ان کی زبان سے مجلس میں ان کا یہ مرثیہ سنا ہے:

جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے

میں نہیں کہہ سکتا کہ میں نے اپنی تمام عمر میں میر انیس سے زیادہ کسی کو فصیح اللسان پایا ہو۔'' اور اپنا یہ شعر بھی لکھا ہے:

ملا انیس سے میں لکھنؤ میں ہوں دو بار
انیس وہ جو خدائے سخن تھے بے تکرار

۱۸۹۸ء میں اشہری نے شبلی نعمانی کی فرمائش پر انیس کے حالات جمع کرنا شروع کیے جو ''حیاتِ انیس'' کے نام سے شائع ہوئے۔ احسن بتاتے ہیں:

''زمانۂ آخر میں جو مجلسیں میر صاحب نے پڑھی ہیں وہ مجھے خواب کی طرح یاد ہیں...... شیخ علی عباس صاحب کی پندرہ صفر کی مجلس سننے کا اتفاق ہوا، اور مرزا والا جاہ مرحوم کی مجلسوں کا نقشہ بھی خواب سا یاد آتا ہے۔ میرے نانا حکیم آغا حسن صاحب ازل مجھے اپنے ساتھ لے جاتے

تھے.......میں مجلس میں بلند ہو ہو کر ان کی صورت دیکھنا چاہتا تھا.......ان کی سریلی آواز میرے کانوں میں گونج جاتی تھی'' اور'' سات سال کی عمر میں سنا ہوا مصرع میرے حافظے میں اس وقت تک محفوظ ہے۔ مصرع: ''دانتوں میں شجاعانِ عرب داڑھیاں دابے'' [انیس نے] مرثیے کو زانوؤں پر رکھ کر دونوں ہاتھوں کو داڑھی کے قریب لا کر اس طرح گردش دی اور فرضی داڑھی کو دانتوں میں دبایا کہ یہ معلوم ہوا عرب کے شجاع سپاہیوں کی حالتِ جنگ جوشِ شجاعت کی تصویر کھینچ دی ہے۔''

☆☆..........☆☆
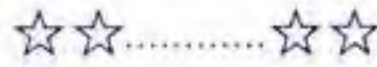
بارھواں باب

بیماریاں، مرضِ موت، وفات

۱۸۷۱ء (۱۲۸۷ھ) میں حیدرآباد کے سفر سے کئی برس پہلے ہی انیس کی صحت ایسی ہو چکی تھی کہ وہ علالت کا عذر کر کے مرثیہ خوانی قریب قریب ترک کیے ہوئے تھے۔ حیدرآباد سے آنے کے بعد ان کی بیماریوں کا وہ سلسلہ شروع ہوا جو مختصر وقفوں اور کمی بیشی کے ساتھ ان کے آخر وقت تک جاری رہا۔ ان کی عمر ستر سے اوپر ہو رہی تھی اور بڑھاپا خود آزار بن کر انھیں لاحق ہو گیا تھا۔ آنکھیں بہت کم زور ہو گئی تھیں۔ دانت بھی زیادہ تر گر گئے تھے۔ ایک بار فالج کا بھی ہلکا سا اثر ہوا لیکن منبر پر پہنچ کر بہ قول مونس اب بھی وہی عالمِ جوانی اور حسنِ کمال مرثیہ خوانی دکھا دیتے تھے۔

۱۸۷۲ء میں وہ وبائی بخار پھیل گیا جس کو تپ لرز، تپ وبائی، بخارِ فصلی، سرخ /لال بخار کہا جاتا تھا۔ اس میں بخار کے ساتھ ہی سخت جوڑی چڑھتی تھی اور بدن میں درد بخار اترنے کے بعد تک رہتا تھا۔ انس ایک خط میں لکھتے ہیں:

”ہر شخص بخار کے بعد گھٹنوں اور ہاتھ کے گٹوں کو باندھے ہوئے ہے۔“

انیس پر شروع ہی میں اس تپ نے حملہ کر دیا تھا۔ انس لکھتے ہیں:

”میر انیس صاحب تپ لرز کے عارضے سے بہت بیمار ہو گئے تھے......
نقاہت اور ناتوانی حد درجہ ہے۔“

اگلے مہینے مونس نے بھی لکھا:

”جناب بھائی صاحب...... پورے ایک مہینے تک بیمار رہے۔ آٹھ عمل مع بدرقہ دیے گئے۔ ضعف کا کیا بتاؤں۔ عالمِ صحت ہی میں ناتواں تھے۔

اس عارضے کے سبب اور بھی کم زور ہو گئے ہیں۔''

اس کے بعد سے ضعف نے انیس کا پیچھا نہیں چھوڑا تاہم اس حالت میں بھی انھوں نے رمضان کے روزے رکھے۔

۱۸۷۴ء/۱۲۹۱ھ انیس کی زندگی کا آخری سال تھا۔ اس سال کے شروع میں ان کی صحت نسبتاً درست تھی۔ ۹ صفر کو مونس نے لکھا، ''جناب برادر سید انیس صاحب بہ صحت و عافیت ہیں'' اور اس کے چھ دن بعد ۱۵ صفر کو انیس نے شیخ علی عباس کے یہاں مرثیہ پڑھا، لیکن اسی سال رجب کے مہینے میں ان کی طبیعت بہت بگڑ گئی۔ انس بتاتے ہیں:

''عارضہ یہ ہے کہ اوّل بخار ہوا شدّت سے...... دو مہینے تک تپ رہی۔ شدائد کم ہوئے مگر تپ رہی۔ ایک ذرّہ تپ میں تخفیف ہوئی تھی، اٹھ کر بیٹھنے لگے تھے کہ تخمہ شدید ہوا کہ بالکل توقع اٹھ گئی تھی۔ حکیم نے جرأت کر کے عمل دیا۔ عمل مفید ہوا کہ طبیعت سنبھل گئی۔''

نفیس بھی بتاتے ہیں کہ انیس کو:

''اوّل کپکپی کے ساتھ بخار چڑھا۔ اس کے بعد اسہال ہوا۔ اس سے کم زوری بہت بڑھ گئی۔ کچھ افاقہ ہوا تھا کہ بخار بہت آیا اور سات آٹھ دن پھر اسہال رہا۔ اسی کے ساتھ دونوں پیروں پر ورم آ گیا۔''

ورم بری علامت ہے۔ یہ جگر کے لیے خطرے کی گھنٹی ہوتی ہے۔ انس لکھتے ہیں:

''اس ورم کا کھٹکا سب سے زیادہ ہے۔ حکیم کہتے ہیں کہ معدہ ابھی تک بچا ہوا ہے مگر کبد (جگر) پر صدمہ ہے۔''

۵ نومبر ۱۸۷۴ء (۲۴ رمضان ۱۲۹۱ھ) سے انیس کی حالت بہت بگڑ گئی اور اب یہ بات طے ہو گئی کہ ان کا مرضِ موت شروع ہو گیا ہے۔

لیکن اس شدید اور مایوس کن بیماری میں بھی انس سے انیس کی ناراضی ختم نہیں ہوئی

بلکہ کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ اس کی تفصیل انس نے اپنے خطوں میں بیان کی ہے کہ جب میں نے انھیں دیکھنے کے لیے جانے کا ارادہ کیا تو انھوں نے کہا کہ اگر وہ آئیں گے تو میں اپنے چھریاں مار لوں گا اور میرے جنازے پر بھی آئیں تو چاہے تین دن گزر جائیں، جب تک وہ چلے نہ جائیں، جنازہ نہ اٹھانا۔

عید کے دن مونس آئے۔ انس نے انیس کا حال دریافت کیا۔ انھوں نے بتایا آج نہایت غشی ہے کہ آنکھ بھی نہیں کھولتے۔ یہ سن کر انس چیخیں مار مار کر رونے لگے اور ان کے گھر کی عورتیں بھی رونے لگیں۔ آخر شام کے قریب انس انیس کے مکان پر پہنچ گئے۔ دیوان خانے میں بیٹھے اور نفیس اور رئیس کو بلوایا۔ دونوں سہمے ہوئے تھے اور رنگ فق ہو گیا تھا۔ انس پردہ کرا کے اندر گئے تو انیس کے بیٹے بیٹیاں سب ڈر کے مارے دالان میں چھپ گئے کہ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ انس وہاں پہنچے جہاں انیس کا پلنگ تھا۔ انس نے سرہانے بیٹھ کر ان کے گال پر گال رکھ دیا اور رو رو کے کہنے لگے:

''میں اس نقاہت کے تصدق ہو گیا ہوتا اور میری آنکھیں اندھی ہو گئی ہوتیں کہ یہ حال نہ دیکھتا۔ برائے خدا آنکھیں کھولیے کہ میں مہینہ بھر سے تڑپتا ہوں۔''

انیس غش میں تھے مگر انس کی آواز پہچانی اور ایسا روئے کہ آنسو تکیے پر ٹپکنے لگے۔ انس نے کہا:

''خداوندا! مجھ سے ان کی نقاہت کی صورت دیکھی نہیں جاتی، ان سے پہلے مجھ کو اٹھا لے''۔

انیس خود بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور آہستہ سے کہا:

''ارے بھائی، کیوں اپنے تئیں مارے ڈالتے ہو۔ میں تو اب اچھا ہوں اور میرے سر کی قسم، سکوت کرو نہیں تو میرا دم اکھڑ جائے گا۔''

اس درمیان لڑکے، لڑکیاں اور سب بہنیں بھی آ کر جمع ہوگئیں۔ انس چپ ہوئے تو انیس نے ان سے اپنی کیفیت بیان کی، پاؤں کا ورم دکھایا۔ انس دس بجے رات تک بیٹھے رہے۔ آخر انیس نے کہا:

''رات بہت آتی ہے۔ گھر دور ہے۔ اب تم جاؤ۔''

اس کے بعد سے انس سہ پہر کو انیس کے پاس جاتے اور دس بجے رات کو واپس آتے تھے۔

انیس کے مرضِ موت کی خبر دوسرے شہروں تک بھی پہنچ گئی تھی اور ان کے عقیدت مند ان کی صحت کے لیے اجتماعی دعائیں کر رہے تھے۔ انس لکھتے ہیں کہ ''اگر بادشاہ بھی بیمار ہوتا تو اس کے لیے خلقت اس طرح دعا نہ کرتی۔'' ان کے معالج کے مطب میں بہ کثرت لوگ ان کی خیریت معلوم کرنے آتے تھے۔ گھر پر بھی عیادت کرنے والوں کا سلسلہ لگا رہتا تھا اور یہ لوگ انیس کے جو امام ضامن باندھتے تھے ان کا ڈھیر لگ جاتا تھا۔ ایک دن شہر کی طوائفیں مل کر ان کی صحت کے لیے چلّہ باندھنے درگاہ حضرت عباس گئیں۔ تندرستی کے دنوں میں انیس چوک سے گزرتے تو طوائفیں اپنے بالا خانوں سے ایک دوسرے کو آواز دیتیں کہ ''آؤ، دیکھو بڑے میر صاحب جا رہے ہیں'' تمام شہر میں انیس کے لیے دعا اور عمل امن یجیب المضطر ہو رہا تھا۔ جماعت کی نماز دن اور مجالسِ عزا میں انیس کی صحت کے لیے عام طور پر دعائیں ہو رہی تھیں۔

لیکن وقتی افاقوں کے سوا انیس کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ بخار پلٹ پلٹ کر آتا اور ان کو نیم جان کر جاتا تھا۔ ایک بار کوئی سات دن تک انھیں گردے کے آس پاس درد کی وجہ سے شدید اذیّت رہی۔ سب سے بڑا مسئلہ ضعف کا تھا جس کے دور ہونے کے آثار نہیں تھے اس لیے کہ ان کی غذا قریب قریب ترک تھی۔ نفیس ان کو ''مغلوبِ ناتوانی'' لکھتے اور بتاتے ہیں کہ ان کی غذا کا وہی حال ہے۔ کبھی تین چوتھائی، کبھی آدھا، کبھی چوتھائی پھلکا اور کبھی بالکل نہیں۔ ہفتہ بھر بعد لکھتے ہیں:

''کم زور اتنے ہو گئے ہیں کہ اٹھنے بیٹھنے کی طاقت نہیں رہ گئی ہے۔ چار دن

سے مہینے بھر کے چوزے کا قلیہ دیا جا رہا ہے، لیکن اس غذا کی طرف ان کو رغبت نہیں ہوتی۔ نوش کرنے میں اکثر ابکائی آ جاتی ہے۔ مجموعاً دو یا تین تولے غذا ہوتی ہے۔''

آخر عمر میں انیس کے معالج حکیم مرزا محمد جعفر، حکیم شیخ علی محمد اور حکیم میر باقر حسین ساکن محبوب گنج شاگردِ حکیم مرزا محمد علی تھے لیکن مرضِ موت کے دنوں میں ان کے صرف ایک معالج حکیم میر باقر حسین کا نام ملتا ہے۔ انس بتاتے ہیں کہ ''وہ ایسا علاج کر رہے ہیں کہ سب حکیم ان کے نسخوں کو دیکھ کر تعریف کرتے ہیں۔'' نفیس نے ان کے نسخے کی یہ تفصیل لکھی ہے:

''تبرید عرق ادویۂ معتدل المزاج...... کشید شدہ...... ہمراہِ تخم گاؤزبان، آبِ مجوا سبز مروّق، بارتنگ سبز دمروّق، سکنجبین بزوری بارد۔''

لیکن اب کوئی دوا کارگر نہیں ہو رہی تھی۔ انیس کے جگر کا فعل ختم ہو چکا تھا۔ غذا نہ پہنچنے سے کمزوری انتہا کو پہنچ رہی تھی اور مرض کے دفاع کی قوت باقی نہیں رہی تھی۔

ان کی ظاہری ہیئت بھی وہ نہیں رہی تھی جو ان کو منبر کی زینت بنائے رکھتی تھی۔ بدن کا گوشت گھل جانے سے وہ بالکل لاغر ہو گئے تھے۔ ایک سلام میں انھوں نے کہا تھا:

جنازہ اٹھانا ہے احباب کو
مناسب ہے گر جسم لاغر رہے

ان آخری دنوں کے حال میں انس بتاتے ہیں:

''اور کیفیت لاغری کی یہ ہے کہ پوست ہڈیوں پر لپٹا ہوا ہے۔''

اس زمانے میں انیس کا چہرہ کسی ڈھانچے کا چہرہ معلوم ہوتا تھا جس پر بڑی بڑی آنکھیں تھیں۔ دانت قریب قریب سب غائب تھے اور سر پر گھنے پٹوں کی جگہ گدّی پر چھدرے بالوں کی ایک جھار سی رہ گئی تھی۔

اپنی یہی صورت دکھا کر انیس نے میر آغا حسین دہلوی کے سامنے ایک برمحل شعر پڑھا

تھا۔ شوکت بلگرامی نے ان کا یہ بیان نقل کیا ہے:

''میں ایک دفعہ حالتِ مرض الموت میں میر صاحب کی عیادت کو گیا تو معلوم ہوا کہ زنان خانے میں تشریف رکھتے ہیں۔ اطلاع کی تو پردہ کروا کے بُلا لیا۔ اندر گیا تو دیکھا میر صاحب مرحوم لحاف سے منھ ڈھانپے لیٹے ہیں اور میر نفیس مرحوم پہلو میں بیٹھے ہیں۔ میں بھی انھی کے پاس بیٹھ گیا اور پکار کے پوچھا کہ میر صاحب مزاج کیسا ہے؟ اس کے جواب میں لحاف کے اندر ہی سے میر صاحب نے فرمایا کہ کیا کہوں۔

ضعف و ناطاقتی و سستی و اعضا شکنی
ایک گھٹنے سے جوانی کے بڑھا کیا کیا کچھ

میں چونکہ ان کی خدمت میں گستاخ تھا اس لیے بے باکانہ عرض کیا کہ حضرت یہ تو آپ میر تقی مرحوم کی زبانی اپنا حال بیان فرما رہے ہیں۔ یہ سن کر میر صاحب نے منھ پر سے لحاف ہٹایا۔ چند سیکنڈ تک بہ غور میری طرف دیکھتے رہے اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کے فرمایا:

اک جوانی کیا گئی سو درد پیدا ہو گئے
تو ہی اے پیری بتا ہم کیا تھے اور کیا ہو گئے

انیس کے شاگرد اور خاص ملنے والے میر سید علی یونس، ساکنِ فاضل نگر، سے شوکت بلگرامی نے میر آغا حسین والا واقعہ بیان کیا تو انھوں نے کہا:

''میں تم کو وہ شعر سناؤں جس کے بعد پھر میر انیس نے کوئی شعر نہیں کہا۔ انتقال کی صبح یا اس سے ایک دن پہلے کا ذکر ہے کہ میر صاحب مرحوم سو کے اٹھے تو میر مونس مرحوم کو بلایا اور فرمایا کہ شب کو ایک مطلع خیال میں آیا ہے۔ اس کو لکھ لو۔ ہمارے بعد خواہ اس پر سلام کہنا، خواہ غزل۔ چونکہ میر

مونس مرحوم کو میر صاحب ہمیشہ غزل گوئی سے روکتے تھے اس لیے غزل کہنے کا اشارہ اس غرض سے کیا کہ ہمارے بعد تم کو غزل گوئی سے کون روکے گا اور اس کے بعد یہ مطلع جو حقیقتاً ان کی شاعری کا مقطع تھا، پڑھا:

سب عزیز و آشنا ناآشنا ہو جائیں گے
قبر میں پیوند جتنے ہیں جدا ہو جائیں گے

ان بیانوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ آخری دنوں میں بھی انیس کا ذہن صحیح کام کر رہا تھا لیکن اب ان کے بچنے کی آس کسی کو نہیں تھی۔

جمعرات ۱۰ دسمبر ۱۸۷۴ء / ۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ کو قریب شام انیس کی آنکھیں نزع کے عالم میں بند تھیں۔ بالکل آخر وقت میں ان کی آنکھیں کھلیں، ہونٹوں پر ہنسی کی سی کیفیت پیدا ہوئی اور دم نکل گیا۔

حافظ سید احمد شاہ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ۲۹ شوال کو وہ چاند دیکھنے نکلے تھے۔ واپس آ رہے تھے کہ چوک میں ہلچل سی نظر آئی ''معلوم ہوا کہ ابھی میر انیس کا انتقال ہو گیا۔ شیخ فضل احمد کیف، خواجہ عزیز الدین سب رو رہے تھے۔'' اور یہ کہ ''میر انیس کے مکان سے کہرام کی آواز یہاں تک آتی رہی'' اور ''رات بھر میرے یہاں نہ کسی نے کچھ کھایا نہ کوئی سویا۔''

وفات کی خبر قریب کے محلوں میں تیزی سے پھیلی۔ لوگوں نے انیس کے مکان کا رُخ کیا۔ ان تعزیت داروں میں سب سے اہم شخصیت دبیر کی تھی، اودھ اخبار کا نامہ نگار لکھتا ہے:

''کہتے ہیں کہ حضرت مرزا دبیر سلمہ اللہ تعالیٰ بھی ان کی نعش پر جا کر بہت روئے اور فرمایا کہ ایسے معجز بیان، فصیح اللسان، قدردان کے اٹھ جانے سے اب کچھ لطف نہ رہا۔''

غروبِ آفتاب کے بعد قمری سنہ کے حساب سے جمعرات ختم ہو کر شبِ جمعہ لگ گئی جس کی اسلامی عقیدے میں ہفتے کی سب راتوں سے زیادہ فضیلت ہے۔ اسی رات انیس کی میت

غسل کے لیے دریائے گومتی لے جائی گئی۔ وہاں سے غفراں مآب کے امام باڑے لائی گئی جہاں مولوی سید بندہ حسن (فرزندِ سلطان العلما سید محمد صاحب مجتہد) نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ شبِ جمعہ کے خیال سے اسی رات سورج نکلنے سے پہلے تدفین ہوگئی۔ قبر اسی باغ میں بنی جہاں خاندان کی قبروں کے لیے انیس پہلے ہی اجازت نامہ حاصل کر چکے تھے۔

دوسرے دن پورے شہر کو اطلاع ہوئی کہ انیس کی وفات بلکہ تدفین بھی ہوگئی۔ اودھ اخبار بتاتا ہے:

''روزِ جمعہ یہ خبر عام ہوئی۔ تمام شہر کو شریک نہ ہونے جنازے کا بہ درجہ کمال ملال رہا کہ خبرِ مرگ جناب مرحوم بہ سبب شہر کے کم مشہور ہوئی تھی۔''

حافظ احمد شاہ نے خط میں یہ بھی لکھا:

''صبح کو سارے لکھنؤ میں ماتم برپا تھا۔ شہر بھر ویران اور بھیانک معلوم ہو رہا تھا...... میر انیس کے مرنے کی وجہ سے بے تعلق لوگوں نے بھی اس شہر میں تقریبات موقوف کر دی تھیں۔''

تدفین کے پانچویں دن سید تقی صاحب کے امام باڑے (عقب مسجد تحسین چوک) میں انیس کے پنجم کی مجلس ہوئی جس میں ہزارہا آدمی شریک تھے۔

ذوالحجہ کی پہلی جمعرات مطابق ۱۴ جنوری ۱۸۷۵ء کو اسی امام باڑے میں انیس کے چہلم کی مجلس ہوئی جس میں نفیس نے ایک فارسی مسدس اور انیس کا ایک ناتمام مرثیہ مکمل کر کے پڑھا اور انیس کی یہ رباعی پڑھی جس پر بہت گریہ ہوا:

دردا کہ فراق روح و تن میں ہو گا
تنہا تنِ ناتواں کفن میں ہو گا
اس وقت کریں گے یاد رونے والے
جس دن نہ انیس انجمن میں ہو گا

اس مجلس میں شرکت کے لیے دوسرے شہروں سے بھی لوگ آئے تھے۔

ذوالحجہ کا مہینا، جس میں انیس کا چہلم ہوا، انس کے حیدرآباد اور مونس کے عظیم آباد جانے کا مہینا تھا۔ انس بیسویں کو سرِ شام حیدرآباد پہنچے۔ تہور جنگ دیر تک انیس کا ذکر کرتے رہے۔ دوسرے دن کثیر تعداد میں لوگ انیس کی تعزیت ادا کرنے انس کے پاس آتے رہے۔

مونس کو نواب بہادر ولایت علی خاں نے لکھا کہ اس بار کچھ پہلے سے عظیم آباد آ جائیے اور یہ بھی لکھا:

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں

یہ مونس کا آخری محرم تھا۔ اسی سال قلبی دورے میں ان کی وفات ہوگئی۔

دبیر کا بھی یہ آخری محرم تھا۔ عظیم آباد کی مجلسوں کے لیے روانہ ہونے سے پہلے وہ انیس کی یہ تاریخِ وفات کہہ چکے تھے:

آسماں بے ماہ کامل سدرہ بے روح الامیں
طُورِ سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس

عظیم آباد سے وہ بیماری کی حالت میں واپس آئے اور اسی محرم میں انیس کی وفات کے تین مہینے بعد اسی مرض ورمِ جگر میں وفات پا گئے جس میں انیس کی وفات ہوئی تھی۔

☆☆............☆☆

کتابیات

۱۔ آبِ بقا: خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت، نامی پریس لکھنؤ، ۱۹۲۸ء

۲۔ آبِ حیات: محمد حسین آزاد، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۲ء

۳۔ آبِ حیات: (در مفردات و مرکبات طب) نواب سید محمد علی خاں عرف نواب دولہا صاحب شمس آبادی، مطبوعہ شمس آباد

۴۔ آتش کدہ: مرزا محمد زکی علی خاں زکی: مطبع کارنامہ، لکھنؤ

۵۔ آفتابِ اودھ: مرزا محمد تقی۔ مشمولہ رسالہ ''مورخ''

۶۔ احوال مرثیہ گویاں (قلمی): نوشتۂ سید ظفر حسن عرف بابو صاحب فائق لکھنوی۔ ذخیرۂ ادیب لکھنؤ

۷۔ اخبارِ دربارِ ابوالنصر، قطب الدین، سلیمان جاہ، سلطانِ عادل، نوشیروان زمان نصیر الدین حیدر شاہ اودھ: (فارسی، قلمی) نقل ذخیرۂ ادیب

۸۔ اختر جناں: مرزا محمد زکی علی خاں زکی مطبع کارنامہ، لکھنؤ ۱۵ر محرم ۱۳۰۵ھ (طبع اول)

۹۔ اختر جناں: مرزا محمد زکی علی خاں زکی مطبع کارنامہ، لکھنؤ ۷ار محرم ۱۳۰۵ھ (طبع ثانی: اضافہ شدہ)

۱۰۔ ادبی مقالے: کاظم علی خاں، ناصر مصنف، لکھنؤ ۱۹۸۳ء

۱۱۔ ادبی میراث: سید علی احمد دانش۔ ناشر مصنف، لکھنؤ ۱۹۹۶ء

۱۲۔ اردو زبان اور میر انیس مغفور (مضمون): شاہ عظیم آبادی، ماہنامہ 'زمانہ' کانپور اکتوبر ۱۹۱۳ء

۱۳۔ اردو مرثیے کا ارتقا: ڈاکٹر مسیح الزماں، کتاب نگر، لکھنؤ ۱۹۶۸ء

۱۴۔ اردو مرثیے کا ارتقا: ڈاکٹر مسیح الزماں، کتاب نگر، لکھنؤ ۱۹۶۹ء

۱۵۔ اردوئے معلیٰ: غالب، انوار المطابع، لکھنؤ ۱۹۲۲ء

۱۶۔ اسلاف میر انیس: سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ کتاب نگر، لکھنؤ ۱۹۷۰ء

۱۷۔ اعمال نامہ: سر سید رضا علی: ہندوستان پبلشرز، دہلی ۱۹۴۳ء

۱۸۔ افادات: سید محمد مصطفیٰ خورشید لکھنوی۔ قومی پریس، لکھنؤ ۱۸۹۰ء

۱۹۔ افسانہ لکھنؤ: آغا جو شرف مرتبہ سید محمود نقوی: نشاط پبلی کیشنز، دہلی ۱۹۸۵ء
۲۰۔ افسانۂ نادر جہاں: طاہرہ بیگم الملقب بہ نواب فخر النساء نادر جہاں بیگم: مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۸۹۴ء
۲۱۔ المیزان: سید نظیر الحسن فوق مہابنی: مطبع فیض عام، علی گڑھ ۱۹۱۴ء
۲۲۔ الہامات قاد: عبدالمالک آروی: ناشر طاق بستاں، آرہ
۲۳۔ امجد علی شاہ: سبط محمد نقوی: ناصر مصنف، اکبر پور، فیض آباد، ۱۹۷۶ء
۲۴۔ امراؤ جان ادا: مرزا محمد ہادی رسوا: ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۹۱ء
۲۵۔ امیر مینائی: شاہ ممتاز علی آہ: ادبی پریس لکھنؤ ۱۹۴۱ء
۲۶۔ انتخابِ غزلیات ناسخ: کاظم علی خاں: اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ ۱۹۸۴ء
۲۷۔ انتخاب نقص: عبدالغفور خاں نساخ: مطبع نظامی کان پور، محرم ۱۲۹۶ھ/جنوری ۱۹۷۹ء
۲۸۔ انتخاب یادگار: امیر احمد امیر مینائی: تاج المطابع رام پور، ۴/ذی الحجہ ۱۲۹۷ھ
۲۹۔ انشائے سرور: مرزا رجب علی بیگ سرور، مرتبہ مرزا احمد علی: مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۹۱۶ء
۳۰۔ انیس: غیر مطبوعہ مرثیے: مرتبہ سید بلاغت حسین رضوی شہاب سرمدی: ناشر مرکزی انیس صدی کمیٹی نئی دہلی۔ ۱۹۹۰ء
۳۱۔ انیس المناقب: انیس، نفیس، تجلی، کتب خانہ ریاض التجارت، لکھنؤ
۳۲۔ انیس اور حیدر آباد: (مراسلہ) نعمت اللہ موسوی۔ روزنامہ 'سیاست' حیدر آباد ۱۸/نومبر ۱۹۸۵ء
۳۳۔ انیس اور فن سپہ گری: (مضمون) سید یحییٰ حسن نقوی: سہ ماہی 'تحریر' دہلی، شمارہ ۴، اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۷۳ء
۳۴۔ انیس اور مرثیہ، زندگی اور پیام: سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی۔ ناشر سید عابد مرتضیٰ، لاہور ۱۹۷۴ء
۳۵۔ انیس شناسی: مرتبہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۸۱ء
۳۶۔ انیس کا ابتدائی اور انتہائی کلام: (مضمون) سید کاظم علی شوکت بلگرامی: رسالہ 'اردوئے معلیٰ' علی گڑھ جون ۱۹۱۰ء
۳۷۔ انیس کی اصلاحیں: (مضمون، قلمی) سید مسعود حسن رضوی ادیب: ذخیرہ ادیب لکھنؤ، نقل مسودہ مصنف
۳۸۔ انیس کے سلام: مرتبہ علی جواد زیدی: ترقی اردو بیورو، نئی دہلی ۱۹۸۱ء
۳۹۔ انیس و خاندان انیس بہ حیثیت نوحہ گو: (مضمون) قمر رضا بارہ بنکوی: رسالہ 'پیام سلام' لکھنؤ ۶/دسمبر ۱۹۵۶ء
۴۰۔ انیسیات: سید مسعود حسن رضوی ادیب: اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ ۱۹۷۶ء
۴۱۔ اودھ آئینہ ایام میں: مرتبہ سید امجد حسین: ناشر محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ، اتر پردیش، لکھنؤ ۱۹۹۶ء
۴۲۔ اودھ سیریز: حصہ اوّل 'مشاہیر اودھ': (قلمی) سید مظفر نواب، ۱۸۵۰ء کتب خانہ ادیب، لکھنؤ

۴۳۔ اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقا: ڈاکٹر اکبر حیدری: مطبوعہ نظامی پریس، لکھنؤ ۱۹۸۱ء
۴۴۔ اے ڈکشنری، ہندوستانی اینڈ انگلش: ڈنکن فوربس، ڈبلیو ایم ایچ ایلن اینڈ کمپنی لندن ۱۸۶۶ء
۴۵۔ ایران میں عزاداری اور مرثیہ گوئی: (قلمی) سید مسعود حسن رضوی ادیب: کتب خانہ ادیب لکھنو
۴۶۔ ایشیائی شاعری: سید امجد علی اشہری: ناول ایجنسی لاہور، طبع ثانی ۱۹۰۵ء
۴۷۔ ایک عہد آفریں شخصیت: مولانا سید جعفر علی بستوی: (مضمون) عتیق احمد بستوی، ماہنامہ 'برہان' دہلی جون ۱۹۷۹ء
۴۸۔ ایک نادر روز نامچہ: مولوی مظہر علی سندیلوی: مرتبہ پروفیسر نور الحسن ہاشمی، ادارہ فروغ اردو، لکھنو
۴۹۔ بارہ دری قیصر باغ لکھنو: (مضمون) شیخ تصدق حسین: اخبار 'سرفراز' لکھنو، کانفرنس نمبر، ۲۴ راگست ۱۹۵۱ء
۵۰۔ بازار سخن: مرتبہ سید محمد میرزا مہذب لکھنوی: انجمن محافظ اردو، لکھنؤ مئی ۱۹۵۱ء
۵۱۔ بازیافت: (مضمون) علی جواد زیدی: سہ ماہی 'تحریر' دہلی اپریل۔ جون ۱۹۷۱ء
۵۲۔ باقیات انیس: مرتبہ ڈاکٹر اکبر حیدری، محمدی پبلشرز، لکھنؤ ۱۹۷۹ء
۵۳۔ باقیات دبیر: مرتبہ ڈاکٹر اکبر حیدری، ناشر مرتب ۱۹۹۴ء
۵۴۔ بستان حکمت: فقیر محمد خاں گویا (طبع قدیم مع خود نوشت گویا) کارخانہ شیخ نثار علی (حسب فرمائش مصنف)
۵۵۔ بوستان اودھ: کنور درگا پرشاد مہر سندیلوی: مطبع دبدبہ احمدی، لکھنؤ ۱۳۰۱ھ/۱۸۹۲ء
۵۶۔ بیاض نمبر ۶: ذخیرۂ ادیب، لکھنؤ
۵۷۔ بیان: بدر الحسن عابدی: ڈاکٹر۔ نوشتہ نیر مسعود ۶ راپریل ۱۹۸۱ء
۵۸۔ حیدر زید پوری، ڈاکٹر سید سید محمد: نوشتہ نیرؔ مسعود
۵۹۔ بیان: خادم حسین، میر: نوشتہ ادیب ۱۷ رنومبر ۱۹۳۹ء
۶۰۔ بیان: خورشید حسین بجنوری، سید: بہ روایت سید ابوالحسن بجنوری ۲۳ رجون ۱۹۳۵ء نوشتہ ادیب
۶۱۔ بیان: رضی حسن خوش نویس، سید: نوشتہ نیرؔ مسعود
۶۲۔ بیان: ''سائق، سید اصغر حسین'' بہ روایت سید علی محمد واثق: نوشتہ نیرؔ مسعود
۶۳۔ بیان: فرخ شاہ: نوشتہ ادیب
۶۴۔ بیان فغفور جاہ عرف نواب چھوٹے آغا: نوشتہ نیرؔ مسعود، ۲۳ ستمبر ۱۹۸۰ء
۶۵۔ بیان: کوثر، نواب سید محمد حسین، کانپوری: نوشتہ نیرؔ مسعود، ۲۱ رجولائی ۱۹۷۸ء

۶۶۔ بیان: معصوم علی سوز خواں، میر: نوشتہ ادیب

۶۷۔ بیان: مہذب لکھنوی، سید محمد میرزا: نوشتہ نیرؔ مسعود، ۲۹ر دسمبر ۱۹۷۵ء

۶۸۔ بیان: نواب علی شال فروش، میر: نوشتہ ادیب ۵ر اکتوبر ۱۹۳۹ء

۶۹۔ بیان: ہاشمی، پروفیسر نور الحسن: نوشتہ نیرؔ مسعود

۷۰۔ بیانات: لائق، سید محمد ہادی: نوشتہ نیرؔ مسعود

۷۱۔ بیانات: مانوس، میر سید علی (فرزندِ عباسی بیگم دخترِ انیس) نوشتہ ادیب

۷۲۔ بیگمات اودھ: شیخ تصدق حسین، کتاب نگر لکھنؤ ۱۹۵۶ء

۷۳۔ پال گومرا کا اسکوٹر: (افسانہ) اُدے پرکاش، سہ ماہی 'آج' کراچی، شمارہ ۱۹، اپریل۔ستمبر ۱۹۹۵ء

۷۴۔ پرانے لکھنؤ کی جھلکیاں: (مضمون) نیر مسعود، ماہنامہ 'ایوان اردو' نئی دہلی نومبر ۱۹۹۸ء

۷۵۔ پیمبرانِ سخن: شاد عظیم آبادی، مرتبہ نقی احمد ارشاد ڈاکٹر سید صفدر حسین، بارگاہ ادب، لاہور ۱۹۷۴ء

۷۶۔ تاریخ آئینہ جمال: سید محمد ہاشم ہاشم جون پوری، اسرار کریمی پریس، الہ آباد ۱۹۳۳ء

۷۷۔ تاریخ اعلیٰ: مترجم سید اولاد حسن، مطبع ریاضی، امروہہ، ۱۹۰۵ء

۷۸۔ تاریخِ اودھ: حصہ چہارم، حکیم محمد نجم الغنی خان رام پوری، مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۹۱۹ء

۷۹۔ تاریخِ اودھ: حصہ پنجم، حکیم محمد نجم الغنی خان رام پوری، مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۹۱۹ء

۸۰۔ تاریخ عزاداری عظیم آباد، پٹنہ: (قلمی) نواب سید وارث اسماعیل رضوی، عظیم آباد (اقتباسات بشکریہ مصنف)

۸۱۔ تاریخ فرح بخش: (فارسی قلمی) جلد دوم۔ محمد فیض بخش کاکوروی تصنیف ذی الحجہ ۱۲۳۴ھ کتب خانہ ادیب

۸۲۔ تاریخ لکھنؤ: حصہ اول، زبدۃ العلما سید آغا مہدی لکھنوی، ناشر جمعیت خدام عزا، کراچی، ۱۹۷۶ء

۸۳۔ تاریخ لکھنؤ: حصہ دوم، زبدۃ العلما سید آغا مہدی لکھنوی، ناشر جمعیت خدام عزا، کراچی، ۱۹۷۶ء

۸۴۔ تجلیات: مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی، نظامی پریس لکھنؤ

۸۵۔ تذکرۃ الذاکرین: سید آغا شہر لکھنوی، شمسی پریس، جھانسی ۱۹۴۶ء

۸۶۔ تذکرۂ بے بہائی تاریخ العلما: سید محمد حسین نوگانوی، جید برقی پریس، دہلی ۱۹۳۱ء

۸۷۔ تذکرہ ذاکرین: محمد علی خاں، مشیر عالم پریس، حیدرآباد ۱۳۶۱ھ

۸۸۔ تذکرۂ شعرائے فرخ آباد: (مضمون) مختار الدین احمد، سہ ماہی 'اردو ادب' علی گڑھ جون۔ستمبر ۱۹۵۴ء

۸۹۔ تذکرۂ کربلا: آغا محمد مرزا، مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۸۹۹ء

۹۰۔ تذکرۂ میر انیس صاحب مرحوم لکھنوی: حافظ حاجی حفیظ الدین احمد مزاج دہلوی۔ صدیقی پریس، بنارس مئی ۱۹۰۷ء
۹۱۔ تذکرۂ نادر: کلب حسین خاں نادر، مرتبہ ادیب، کتاب نگر لکھنؤ ۱۹۵۷ء
۹۲۔ تذکرۂ ہندی: (فارسی) شیخ غلام ہمدانی مصحفی، مرتبہ مولوی عبدالحق۔ انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد ۱۹۳۳ء
۹۳۔ ترتیب افکار: (گلدستہ مشاعرہ بنا کردہ ثریا قدر)۔ مرتبہ سید مرتضیٰ، مطبع مجتبائی لکھنؤ ۱۳۱۴ھ
۹۴۔ تردید موازنہ: شیخ محمد جان عروج فیض آبادی، نوشتہ حسن رضا، مطبع تصویر عالم لکھنؤ
۹۵۔ تلاش و تحقیق: کاظم علی خاں، ناشر مصنف، لکھنؤ ۱۹۸۹ء
۹۶۔ تنقید آب حیات: میر محمد رضا ظہیر، اردو پریس لکھنؤ
۹۷۔ تواریخ مع تصاویر راجگان و تعلقداران ملک اودھ: داروغہ حاجی عباس علی، مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۸۸۰ء
۹۸۔ تواریخ نادر العصر: منشی نول کشور، مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۸۶۳ء
۹۹۔ توشۂ آخرت: واجد علی شاہ اختر، مطبع سلطانی، کلکتہ ۱۲۹۹ھ
۱۰۰۔ توقیتِ غالب: ڈاکٹر کاظم علی خاں، انجمن ترقی اردو، نئی دہلی ۱۹۹۹ء
۱۰۱۔ تین تذکرے: مرتبہ نثار احمد فاروقی، مکتبہ برہان دہلی، ۱۹۶۸ء
۱۰۲۔ ثمرات الانظار فی ما مضیٰ من الآثار: چودھری محمد شوکت علی سندیلوی، مطبع علوی، لکھنؤ ۱۸۹۲ء
۱۰۳۔ جام جہاں نما: (مضمون عارف نوشاہی، سہ ماہی 'اردو' کراچی، شمارہ ۱، ۱۹۸۹ء
۱۰۴۔ جدید مرثیے کے بانی ضمیر لکھنوی: علی جواد زیدی ناشر مصنف، لکھنؤ ۱۹۹۸ء
۱۰۵۔ جناب سید علی حامد و تنقید کلام موصوف: (قلمی) شیخ ممتاز حسین جون پوری، مسودۂ مصنف، کتاب خانہ ادیب
۱۰۶۔ جنتری صد سالہ: نامی پریس، لکھنؤ ۱۹۱۱ء
۱۰۷۔ جواب اودھ بلو بک: واجد علی شاہ، مطبع نامعلوم، سنہ طباعت غالباً ۱۲۷۲ھ-۱۲۷۳ھ (۱۸۵۶ء-۱۸۵۷ء) کتب خانہ ادیب
۱۰۸۔ جواب صواب: مولوی سید گلشن علی، مطبوعہ بنارس ۱۲۶۱ھ
۱۰۹۔ جوش اور دیار دکن: مائل ملیح آبادی، ناشر مصنف، ۱۹۸۴ء
۱۱۰۔ جیون چرتر مہاراتکیت رائے، کالی پرشاد: لال جی، مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۹۰۳ء
۱۱۱۔ چشمہ فیض: (فارسی، قلمی) محمد فیض بخش کاکوروی، مخطوطہ، ڈاکٹر ذکی کاکوروی
۱۱۲۔ چمنستانِ بلاغت: (قلمی) مولفہ و مکتوبہ سید رضا علی رضوی ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۷ء

۱۱۳۔ چند واقعات انیس و دولھا صاحب: (قلمی) سید حسن رضا، کتب خانہ ادیب
۱۱۴۔ حال فارغ: حکیم سید نہال حسین، مرقع عالم پریس، ہردوئی ۱۹۰۲ء
۱۱۵۔ خزنِ اختر: واجد علی شاہ اختر مرتبہ امجد علی خاں، ناشر مرتب ۱۹۸۱ء
۱۱۶۔ حضرت رشید: سید آغا اشہر لکھنوی: اصح المطابع لکھنؤ ۱۹۲۲ء
۱۱۷۔ حضرت میر انیس کی حیدرآباد میں آمد: (مراسلہ) سید علی احمد، روزنامہ 'سیاست' حیدرآباد، ۱۱رنومبر ۱۹۸۵ء
۱۱۸۔ حیات انیس: سید امجد علی اشہری، ترمیم شدہ ایڈیشن، مطبع آگرہ اخبار، آگرہ، ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۴ء-۱۹۲۵ء
۱۱۹۔ حیات جلیل: سید مقبول احمد صمدنی، ناشر رام نرائن لال، الہ آباد ۱۹۲۹ء
۱۲۰۔ حیات دبیر: جلد اول، سید افضل حسین رضوی ثابت لکھنوی، سیوک اسٹیم پریس، لاہور، ۱۹۱۳ء
۱۲۱۔ حیات دبیر: جلد دبیر، سید افضل حسین رضوی ثابت لکھنوی، سیوک اسٹیم پریس، لاہور، ۱۹۱۳ء
۱۲۲۔ حیات عبدالحی: سید ابوالحسن علی ندوی، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۷۰ء
۱۲۳۔ حیات فردوس مکان: سید محمد معروف بہ علامہ ہندی، مطبع تصویر عالم لکھنؤ
۱۲۴۔ حیات فریاد: شاد عظیم آبادی، مطبع معارف، دارالمصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۲۷ء
۱۲۵۔ حیات مولانا کرامت حسین: حامد علی خاں، مطبع الناظر و نور المطابع لکھنؤ ۱۳۳۶ھ
۱۲۶۔ حیات آباد دکن میں میر انیس کی مجلسیں: (مضمون) سید بادشاہ حسین، روزنامہ 'سیاست' حیدرآباد، ۴رنومبر ۱۹۸۵ء
۱۲۷۔ خاندانِ میر انیس کے نامور شعرا: ضمیر اختر نقوی، مرکز علوم اسلامیہ، کراچی، ۱۹۹۴ء
۱۲۸۔ خزانۃ التواریخ: نواب محمد جعفر علی خاں، مطبع نظائر قانون ہند، فتح گڑھ، ۱۹۱۱ء
۱۲۹۔ خطبات راجا صاحب محمود آباد: مرتبہ سید اشتیاق حسین، محبوب اکیڈمی، کراچی، ۱۹۹۷ء
۱۳۰۔ خطبات مشران: پنڈت سندر نرائن مشران، سرفراز قومی پریس، لکھنؤ
۱۳۱۔ خطوط مشاہیر بہ نام سید مسعود حسن رضوی ادیب: مرتبہ نیر مسعود، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ ۱۹۸۵ء
۱۳۲۔ خوش معرکۂ زیبا: سعادت خاں ناصر مرتبہ مشفق خواجہ، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۰ء
۱۳۳۔ خوش معرکۂ زیبا: سعادت خاں ناصر مرتبہ سید محمد شمیم انہونوی، نسیم بک ڈپو لکھنؤ، ۱۹۷۱ء
۱۳۴۔ وٹورسٹس گائڈ ٹو لکھنؤ: (انگریزی) چھٹا ایڈیشن ۱۹۰۷ء
۱۳۵۔ ولائف اینڈ وٹائمس آف راجا صاحب آف محمود آباد: (انگریزی) حصہ اول سید اشتیاق حسین،

محبوب اکیڈمی، کراچی ۱۹۹۰ء

۱۳۶۔ دلکھنو البم: (انگریزی) نول کشور پریس، ۱۸۹۴ء

۱۳۷۔ دبستان عشق کی مرثیہ گوئی: ڈاکٹر جعفر رضا، دوسرا ایڈیشن، شبستان، الہ آباد، ۱۹۹۳ء

۱۳۸۔ دبیر اور شمس آباد: محمد صادق (صفوی) ناشر مصنف، شمس آباد، ۱۹۸۹ء

۱۳۹۔ دربار حسین: سید افضل حسین ثابت لکھنوی: مطبع اثنا عشری، دہلی، ۱۹۲۲ء

۱۴۰۔ دربار حسین: سید تصدق حسین صدق جائسی، کتاب نگر لکھنؤ ۱۹۶۲ء

۱۴۱۔ دفتر ماتم: جلد ۱۲، مرزا سلامت علی دبیر، عبدالحسین تاجر کتب، لکھنؤ، ۱۸۹۷ء

۱۴۲۔ دفتر ماتم: جلد ۱۵، مطبع دبدبۂ احمدی، لکھنؤ

۱۴۳۔ دفتر ماتم: جلد ۱۶، مطبع دبدبۂ احمدی، لکھنؤ

۱۴۴۔ دفتر ماتم: جلد ۱۷، حصہ دوم مطبع دبدبۂ احمدی، لکھنؤ، ۱۸۹۷ء

۱۴۵۔ دفتر ماتم: جلد ۱۸، حصہ دوم مطبع دبدبۂ احمدی، لکھنؤ، ۱۸۹۷ء

۱۴۶۔ دفتر ماتم: جلد ۱۹، حصہ دوم مطبع دبدبۂ احمدی، لکھنؤ، ۱۸۹۷ء

۱۴۷۔ دفتر ماتم: جلد ۲۰، حصہ دوم مطبع دبدبۂ احمدی، لکھنؤ، ۱۸۹۷ء

۱۴۸۔ دکن میں مرثیہ اور عزاداری، ۱۸۵۷ء تا ۱۹۵۷ء: ڈاکٹر رشید موسوی نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، حیدر آباد، ۱۹۷۰ء

۱۴۹۔ دولھا صاحب عروج: مرتبہ نیر مسعود، اردو پبلشرز، لکھنؤ، ۱۹۸۰ء

۱۵۰۔ دیوان برق: فتح الدولہ محمد رضا خاں برق لکھنوی: مطبع سلطانی لکھنؤ، ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۳ء

۱۵۱۔ دیوان درد: مرتبہ ڈاکٹر ظہیر صدیقی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۶۳ء

۱۵۲۔ دیوان ذوق: مرتبہ محمد حسین آزاد: مطبع اسلامیہ، لاہور (تخمیناً ۱۸۹۱ء)

۱۵۳۔ دیوان عشق: (قلمی) سید حسین میرزا عشق: کتب خانہ ادیب

۱۵۴۔ دیوان فصاحت عنوان: میر نواب مونس: مطبع شاہی، عبدالحسین بار دوم جولائی ۱۹۱۳ء

۱۵۵۔ دیوان منشی لال چند انس: مطبع علی بخش، لکھنؤ ۱۲۶۹ھ

۱۵۶۔ دیوان میر: (نسخہ ۱۲۰۳ھ) ترتیب و تدوین ڈاکٹر اکبر حیدری: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، سری نگر ۱۹۷۳ء

۱۵۷۔ ذاتِ شریف: مرزا محمد ہادی رسوا (سرورق ندارد)
۱۵۸۔ ذخیرۂ مناقب: میر محمد سلیس وغیرہ نظامی پریس لکھنؤ
۱۵۹۔ ذکاء اللہ حیات اور ان کے علمی و ادبی کارنامے: ڈاکٹر رفعت جمال: ساقی بک ڈپو، دہلی، ۱۹۹۰ء
۱۶۰۔ راحت رسا: (فارسی، قلمی)، سید محمد وزیر، مشمولہ مکاتبات وزیر، مملوک ڈاکٹر ذکی کاکوروی
۱۶۱۔ رباعیات انیس: مرتبہ علی جواد زیدی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء
۱۶۲۔ رجب علی بیگ سرور: چند تحقیقی مباحث: ڈاکٹر حنیف نقوی، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، ۱۹۹۱ء
۱۶۳۔ رجب علی بیگ سرور، حیات اور کارنامے: نیر مسعود ناشر شعبہ اردو، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد ۱۹۶۷ء
۱۶۴۔ ردِ واقعات انیس: سردار میرزا، اصح المطابع لکھنؤ ۱۹۰۸ء
۱۶۵۔ رسالۃ المکاتیب فی رویۃ الثعالب والغرابیب: (فارسی) مولوی حیدر علی فیض آبادی، (بہ تصحیح مصنف) شرف المطابع، دہلی ۱۲۶۸ھ
۱۶۶۔ رقعاتِ مرزا قتیل: (فارسی، قلمی) مخطوطہ ذخیرۂ ادیب، لکھنؤ یونیورسٹی ٹیگور، لائبریری لکھنو
۱۶۷۔ رنگین بازار وانشائے نحیف: (فارسی) منشی کالکا پرشاد نحیف۔ نادرن انڈیا پرنٹنگ پریس لکھنؤ ۱۹۱۵ء
۱۶۸۔ روٹس آف انڈین شیعزم ان ایران اینڈ عراق: ریلیجن اینڈ اسٹیٹ ان اودھ، ۱۸۵۹-۱۷۲۲ (انگریزی) جے آر آئی کول، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، نئی دہلی، ۱۹۸۹ء
۱۶۹۔ روحِ انیس: مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب، طبع اول مع تصاویر، انڈین پریس لمٹیڈ، الہ آباد ۱۹۳۱ء
۱۷۰۔ روحِ انیس: مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب، طبع سوم، کتاب نگر لکھنؤ ۱۹۶۴ء
۱۷۱۔ ریاحین الانشاء: (فارسی قلمی) کتب خانہ ادیب
۱۷۲۔ ریاض البحر: دیوان شیخ امداد علی بحر، مطبع مصطفائی لکھنؤ ۱۲۸۵ھ
۱۷۳۔ ریاض الفصحا: (فارسی) شیخ غلام ہمدانی مصحفی، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد ۱۹۳۴ء
۱۷۴۔ ریاض خلد: سید ریاض الدین حسن ریاض: مرتبہ سید قمقام حسین جعفری و سید سہیل بخاری، ناشر سید سلطان حسین، کراچی ۱۹۸۳ء
۱۷۵۔ ریحان غم: انیس، وحید، سرفراز، قلمی نقل از کبیر الدین احمد ۳۲۔۱۹۳۱ء
۱۷۶۔ سالانہ رپورٹ انجمن ترقی اردو: شاخ ایجوکیشنل کانفرنس بابت ۱۹۰۳ء، شبلی نعمانی۔ مطبع شمسی حیدر آباد
۱۷۷۔ سبع مثانی: مرتبہ سید سرفراز حسین رضوی خبیر لکھنوی، (مقدمہ از ثابت) نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۳۰ء

۱۷۸۔ سبیکۃ الذہب معیار الادب: (عربی) حکیم سید علی اکبر المدعو بہ حکیم سید اکبر شاہ موسوی دہلوی، مطبع اثنا عشری، لکھنؤ، ۱۳۰۹ھ

۱۷۹۔ سراپا سخن: سید محسن علی محسن: مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۱ء

۱۸۰۔ سروغم: نواب میر محمد حسین خان امیرؔ: مطبع شوکت جعفری، لکھنؤ ۱۹۳۸ء

۱۸۱۔ سریلی بانسری: سید انور حسین آرزو لکھنوی، انڈین بک ڈپو لکھنؤ ۱۹۳۸ء

۱۸۲۔ سعادت یار خاں رنگین، حیات و نگارشات: ڈاکٹر حسن آرزو، مکتبہ نشید یدیہ، مئو ناتھ بھنجن ۱۹۸۴ء

۱۸۳۔ سلام حسین ابن علی: (قلمی) مرتبہ و نوشتہ راحت علی، کتب خانہ ادیب

۱۸۴۔ سلام ہائے انس: (قلمی) مرتب نا معلوم، مجموعہ ۱۴، کتب خانہ ادیب

۱۸۵۔ سلطان علی واجد علی شاہ: سید مسعود حسن رضوی ادیب، آل انڈیا میر اکادمی لکھنؤ ۱۹۷۷ء

۱۸۶۔ سنان دل خراش (قلمی) سید اسماعیل حسین منیرؔ شکوہ آبادی، نقل مخطوطہ شمس آباد، لکھنؤ یونیورسٹی ٹیگور لائبریری، لکھنؤ

۱۸۷۔ سوانح عمری (فارسی) محمد کاظم، مطبع گنگا پرشاد ورما لکھنؤ ۱۳۰۸ھ

۱۸۸۔ سوانح عمری آغائی صاحب: عبد الحلیم شرر، مرتبہ تقی رضا، مطبوعہ الخطاط پرنٹرز لکھنؤ ۱۹۹۵ء

۱۸۹۔ سوانح عمری دولھا صاحب عروجؔ: (قلمی) سید حسن رضا عرف بھمن مرتبہ خوان، کتب خانہ ادیب

۱۹۰۔ سوانحِ لکھنو: (فارسی) نجات حسین خاں عظیم آبادی، مشمولہ مجلّہ معاصر، پٹنہ (شمارہ ۱۸)

۱۹۱۔ سوانحات سلاطینِ اودھ: سید کمال الدین حیدر، مطبع نول کشور، کان پور ۱۹۰۷ء

۱۹۲۔ سید ناصر علی خاں بہادر ذوالقدر جون پوری اور ان کے بھائیوں کے حالات زندگی: (قلمی) سید علی حامد حامدؔ جون پوری، کتب خانہ ادیب

۱۹۳۔ سیر المتاخرین: (فارسی) سید غلام حسین طباطبائی، میڈیکل پریس، کلکتہ ۱۲۴۸ھ

۱۹۴۔ سیف المومنین ملقب بہ کشف الرین فی اثبات العزا علی الحسین: (فارسی) حکیم ابو علی خاں، مطبع مطلع نور (مقام و سنہ اشاعت ندارد)

۱۹۵۔ شادؔ کی کہانی شادؔ کی زبانی: مرتبہ محمد مسلم عظیم آبادی، انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ ۱۹۶۱ء

۱۹۶۔ شاگردانِ انیسؔ: ڈاکٹر سید تقی حسین جعفری، مکتبہ جعفریہ، کراچی ۱۹۷۹ء

۱۹۷۔ شاہان اودھ کی خدمات عزاداری کے فروغ میں: (مضمون) صادق حسین خنداںؔ، اخبار سرفراز لکھنؤ

محرم و نمبر ۱۳۸۷ھ / ۱۹۶۷ء

۱۹۸۔ شاہکار وحید: مرتبہ شبیب علی حسین، ناشر گہرستان، جون پور ۱۹۶۶ء

۱۹۹۔ شجرات طیبات: سید ظہور الحسن فروغ سیتاپوری، امیر المطابع، سیتاپور ۱۳۳۶ھ

۲۰۰۔ شجرۂ اولاد خلیق و انیس وغیرہ: بہ روایت میر سید علی مانوس، نوشتہ ادیب

۲۰۱۔ شعرائے اردو کے تذکرے: ڈاکٹر حنیف نقوی، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ ۱۹۷۶ء

۲۰۲۔ شمس الضحیٰ: (فارسی) ابو محمد معروف بہ صفدر حسین، تتمہ از بہادر حسین وحید، مطبع اثنا عشری لکھنؤ

۲۰۳۔ شمع تعزیت: سید محمد عنایت حسین متین سامانی سہارن پوری، مطبع روہیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی، بریلی ۱۸۸۰ء

۲۰۴۔ شیوع فیض: واجد ہی شاہ اختر: مطبع سلطانی، کلکتہ ۱۲۷۷ھ

۲۰۵۔ صحیفہ زریں: مرتبہ پراگ نرائن بھارگو، مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۹۰۲ء

۲۰۶۔ صفی لکھنوی: مصطفیٰ فطرت، ناشر مصنف لکھنو

۲۰۷۔ ضمیر کی مرثیہ گوئی: (مضمون) سید محمد محسن رضوی لکھنوی، ماہنامہ زمانہ، کان پور، اگست ۱۹۳۵ء

۲۰۸۔ ضیاء نور: دیوان میر وزیر نور لکھنوی: مطبع کارنامہ لکھنؤ ۱۲۹۶ھ

۲۰۹۔ طاہرہ: عبدالحلیم شرر، دلگداز پریس، لکھنؤ ۱۹۳۴ء

۲۱۰۔ طریق نثر خوان: میر فدا علی فدا نثر خوانث مطبع نامی، لکھنؤ ۱۸۸۹ء

۲۱۱۔ ظہیر الانشاء: (فارسی) منشی ظہیر الدین بلگرامی، مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۲۸۲ھ

۲۱۲ عجائبات فرنگ: سفرنامہ یوسف خاں کمل پوش، مرتبہ تحسین فراقی، مکہ بکس، لاہور ۱۹۸۳ء

۲۱۳۔ عرض داشت میر نواب مونس بہ خدمت واجد علی شاہ: مسودۂ مصنف، ذخیرہ ادیب

۲۱۴۔ عرفان انیس: (مضمون) سید کمال الدین حسین ہمدانی، سہ ماہی 'تحریر' دہلی، اکتوبر۔ دسمبر ۱۸۷۷ء

۲۱۵۔ عروج اردو: (قلمی) سید خورشید حسن عرف دولھا صاحب عروج لکھنوی، کتب خانہ ادیب

۲۱۶۔ عشق نامہ: (فارسی، قلمی) واجد علی شاہ اختر، نقل مخطوطہ محمود آباد، ذخیرۂ ادیب

۲۱۷۔ عشق نامہ: (اردو، قلمی) واجد علی شاہ اختر، ذخیرۂ ادیب

۲۱۸۔ عشق نامہ: واجد علی شاہ اختر، مطبع سلطانی، کلکتہ

۲۱۹۔ عظیم آباد میں میر انیس کی آمد: (مضمون) ہوش عظیم آبادی مشمولہ 'میر انیس' ناشر غالب کلب، پٹنہ

۲۲۰۔ عقیدت: مرتبہ رضا حسین رضوانی، عباس پرنٹرز، کراچی

۲۲۱۔ عکس زار: سید علی احمد دانش، ناصر مصنف، لکھنؤ ۱۹۸۷ء

۲۲۲۔ علم دار کربلا: سید محمد افضل فارغ سیتاپوری، مرتبہ محمد صفدر آہ سیتاپوری

۲۲۳۔ عماد السعادت: (فارسی) سید غلام علی نقوی، مطبع نول کشور لکھنؤ

۲۲۴۔ عمدۂ منتخبہ: (فارسی) اعظم الدولہ میر محمد خاں بہادر سرور ناشر شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی ۱۹۶۱ء

۲۲۵۔ عیار الشعراء: (فارسی، قلمی) خواب چند ذکا، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۲۲۶۔ غالب کا ایک مکتوب الیہ، یوسف میرزا ناصر لکھنوی: (مضمون) ڈاکٹر اکبر حیدری، روزنامہ 'قومی آواز' لکھنؤ ضمیمہ ۸ ستمبر ۱۹۹۶ء

۲۲۷۔ غزلیات جلیس: سید ابو محمد عرف ابو صاحب جلیس: مرتبہ سید علی محمد واثق لکھنوی، ناشر مرتب، لکھنؤ ۱۹۸۶ء

۲۲۸۔ فاتحوں کی کتاب (قلمی): نوشتہ علی محمد عارف وغیرہ، مملوکہ علی محمد واثق

۲۲۹۔ فردوسی ہند: صفدر آہ، کتاب کدہ، بمبئی ۱۹۵۸ء

۲۳۰۔ فرمانِ سلیمانی: (مضمون) مشفق خواجہ مشمولہ 'نذر حمید'

۲۳۱۔ فرہنگ آصفیہ: جلد ۴، سید احمد دہلوی، نیشنل اکاڈمی دہلی، ۱۹۷۴ء

۲۳۲۔ فسانہ دلفریب: فدا علی عیش لکھنوی، مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۹۱۴ء

۲۳۳۔ فسانہ عبرت: مرزا رجب علی بیگ سرور: مطبع نجم العلوم کارنامہ، لکھنؤ ۱۸۸۴ء

۲۳۴۔ فسانہ عجائب: مرتبہ رشید حسن خاں، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، ۱۹۹۰ء

۲۳۵۔ فسانہ عجائب: ایک خاص ایڈیشن، مرتبہ ڈاکٹر سید سلیمان حسین رضوی، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ

۲۳۶۔ فکرِ بلیغ: (قلمی) سید علی محمد شاد عظیم آبادی، نقل مسودہ مصنف بہ مقابلہ وتصحیح ادیب، کتب خانہ ادیب

۲۳۷۔ فکرِ بلیغ: سید علی محمد شاد عظیم آبادی، مرتبہ نقی احمد ارشاد، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ ۱۹۷۴ء

۲۳۸۔ فنِ سپہ گری: استاد مبارک حسین لکھنوی، ناشر مصنف، لکھنؤ ۱۹۷۴ء

۲۳۹۔ فیض نشان: دیوانِ نواب والا جاہ عاشق، مطبع مصطفائی، لکھنؤ ۱۲۹۱ھ

۲۴۰۔ قرآن مجید: مع ترجمہ از مولوی فرمان علی۔ نظامی پریس لکھنؤ

۲۴۱۔ قصہ ایک شعر کا: (مضمون) شبیر علی خاں شکیب: مجلّہ 'نقوش' لاہور، شمارہ ۱۳۲، جون ۱۹۸۵ء

۲۴۲۔ قصہ عبرت مزیل وحشت: (قلمی) شفاء الدولہ حکیم سید افضل علی رضوی فیض آبادی، کتابت ۱۲۷۴ھ کتب خانہ ادیب

۲۴۳۔ قصیدہ در مدح جناب امیر علیہ السلام: والا جاہ عاشق، مطبع حسینی اثنا عشری، لکھنؤ ۱۲۸۷ھ

۲۴۴۔ قطرۂ محیط بحر ہند: مترجم منشی درگا دیال سندیلوی، مطبع مصطفائی لکھنؤ ۱۳۰۳ھ

۲۴۵۔ قطعۂ تاریخ وفات مرزا محمد عباس از میر خورشید علی نفیس: (مملوکہ علی محمد واثق)

۲۴۶۔ قطعۂ تاریخ وفات بیگم جان: از انیس مملوکہ واثق

۲۴۷۔ قیصر التواریخ: سید کمال الدین حیدر، مطبع نول کشور ۱۹۰۷ء

۲۴۸۔ کاغذات مملوکہ بلرام پرشاد سکینہ: (بہ سلسلہ لفظ 'رنگا')

۲۴۹۔ کاغذاتِ میر نواب مونس: (عرض داشتیں، مسودات کلام وغیرہ) ذخیرہ ادیب

۲۵۰۔ کاغذاتِ نواب قمر النسا تاج محل: (زوجہ نصیر الدین حیدر) ذخیرہ ادیب

۲۵۱۔ کوبۂ فارغ: مراثی فارغ سیتاپوری، مرتبہ سید محمد حید رندیم، امیر المطابع، سیتاپور ۱۳۳۴ھ

۲۵۲۔ کیلنڈرس آف مڈل ایسٹ کنٹریز: (انگریزی) 'نوکا' پبلشنگ ہاؤس، ماسکو ۱۹۷۹ء

۲۵۳۔ گلدستۂ انیس: مرتبہ سید صغیر حسین نقوی، اردو پبلشرز، لکھنؤ ۱۹۷۶ء

۲۵۴۔ گلدستہ بکا: (قلمی) سید علی یونس شاگرد انیس، کتب خانہ ادیب

۲۵۵۔ گلدستۂ جناں: جلد دوم، نواب مرزا باقر علی خاں تشفی، مطبع دبدبہ احمدی لکھنؤ ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۳ء

۲۵۶۔ گلدستۂ عشق: دیوان سید محمد خاں رند، مطبع مصطفائی، کان پور ۱۲۶۸ھ

۲۵۷۔ گلدستۂ ماتم: (قلمی) سید علی یونس، کتب خانہ ادیب

۲۵۸۔ گلزارِ آصفیہ: خان زماں خواجہ غلام حسین، سید رستم علی تاجر کتب، حیدر آباد

۲۵۹۔ گلشنِ تعشق: دیوان مظفر علی اسیر، مطبع نول کشور، لکھنؤ

۲۶۰۔ گلشنِ حیات: سید معین الدین احمد قیس رضوی، طبع ثانی ۱۳۴۴ھ/۱۹۲۵ء

۲۶۱۔ گلشنِ گفتار: (فارسی) خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی، مرتبہ سید محمد، خورشید پریس، حیدر آباد ۱۳۳۹ فصلی

۲۶۲۔ گم شدہ تحریریں: (مضمون نیر مسعود، شش ماہی 'سوغات' بنگلور، شمارہ ۱۰، مارچ ۱۹۹۶ء

۲۶۳۔ لائف: علامہ غلام حسنین کنتوری، نوشتۂ حبیب حسین، خادم التعلیم اسٹیم پریس، لاہور

۲۶۴۔ لکھنؤ: (لکھنؤ کے محرم کی رپورٹ) اودھ اخبار، لکھنؤ ۱۲/اپریل ۱۸۷۰/ ۱۰/محرم ۱۲۸۷ھ

۲۶۵۔ لکھنؤ کی زبان: محمد باقر شمس، دار التصنیف، کراچی، ۱۹۵۴ء

۲۶۶۔ لوحِ تاریخ: (قلمی) میر بہادر علی سید (نیز نور، گردش، وامق) عکسِ مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری، لندن

۲۶۷۔ مالک الدولہ صولتؔ: (مضمون) نظم طباطبائی، مشمولہ نوبت رائے نظرؔ کا ادیبؔ انتخاب از عابد رضا بیدارؔ ۱۹۸۸ء

۲۶۸۔ مثنویات میر حسن: نول کشور پریس لکھنؤ، ۱۹۴۵ء

۲۶۹۔ مجالس رنگین: (فارسی) سعادت یار خاں رنگین، مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ، نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۲۹ء

۲۷۰۔ مجموعہ جنتری صد سالہ شام لال: لا پریس، کانپور ۱۹۰۶ء

۲۷۱۔ مجموعہ رباعیات انیسؔ: مرتبہ سید محمد عباس، نول کشور پریس لکھنؤ ۱۹۴۸ء

۲۷۲۔ مجموعہ سخن (قلمی): مرتبہ و مکتوبہ غلام مہدی لکھنوی، کتب خانہ ادیبؔ لکھنؤ

۲۷۳۔ مجموعہ مخمسات وسلام ہائے میر ضمیرؔ: (قلمی) کتب خانہ ادیب

۲۷۴۔ مجموعہ مراثی: (اہتمامی مخطوطہ) خلیقؔ، فصیحؔ وغیرہ۔ کتب خانہ ادیب

۲۷۵۔ مجموعہ مکاتبات سید محمد وزیرؔ: (فارسی، قلمی) مملوکہ ڈاکٹر ذکی کاکوروی

۲۷۶۔ مجموعہ نغز (فارسی): قدرت اللہ قاسمؔ، مرتبہ محمود شیرانی، سلسلہ نشریات کلیہ پنجاب، لاہور، ۱۹۳۳ء

۲۷۷۔ محاربہ عظیم: منشی کنہیا لال، نول کشور پریس، کان پور، چھٹا ایڈیشن ۱۹۰۳ء

۲۷۸۔ محبوب الزمن: حصہ اول، عبدالجبار خاں صوفی ملکاپوری، مطبع رحمانی، (حیدرآباد: ۱۳۲۹ھ)

۲۷۹۔ محبوب الزمن: حصہ دوم، عبدالجبار خاں صوفی ملکاپوری، مطبع رحمانی، (حیدرآباد) ۱۳۲۹ھ

۲۸۰۔ محمد حسین آزاد، حیات اور تصانیف: جلد اول، ڈاکٹر اسلم فرخی، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی ۱۹۶۵ء

۲۸۱۔ محمد حسین آزاد، حیات اور تصانیف: جلد دوم، ڈاکٹر اسلم فرخی، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی ۱۹۶۵ء

۲۸۲۔ مختصر تاریخ خاندان اجتہاد لکھنؤ: سید شبیر حسن محسنؔ۔ نور المطابع لکھنؤ ۱۹۲۲ء

۲۸۳۔ مخزن اسرار سلطانی معروف بہ رقعات بیگمات: مرتبہ محمد امتیاز علی خاں نجیبؔ، مطبع مورس کمپنی فرخ آباد ۱۹۰۲ء

۲۸۴۔ مخزن نکات: (فارسی) قیام الدین قائمؔ چاندپوری، مرتبہ مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد ۱۹۲۹ء

۲۸۵۔ مذاہب عاشقانہ: دیوان والا جاہ عاشق، مطبع قادری بمبئی ۱۲۷۵ھ

۲۸۶۔ مراثی انیس: جلد دوم مرتبہ سید علی حیدر نظم طباطبائی، نظامی پریس بدایوں بار دوم ۱۹۳۶ء

۲۸۷۔ مراثی لطیفؔ: (قلمی) محمد لطیف شاگرد انیسؔ، کتب خانہ ادیب

۲۸۸۔ مراثی میر انیسؔ مرحوم: جلد اول، مطبع تیج کمار لکھنؤ، آٹھواں ایڈیشن ۱۹۵۸ء

۲۸۹۔ مراثی محبؔ: محمد علی محمد خاں محبؔ، دار التصنیف والتالیف امیریہ لکھنؤ ۱۹۶۰ء

۲۹۰۔ مراثی میر خلیق: مرتبہ ڈاکٹر اکبر حیدری، مرتبہ فاؤنڈیشن، کراچی ۱۹۹۷ء۔

۲۹۱۔ مراسلہ ڈاکٹر اکبر حیدری (بہ سلسلہ امام باڑہ بتولی بیگم) ماہنامہ طلوع افکار کراچی، جولائی اگست ۱۹۹۶ء۔

۲۹۲۔ مراسلہ علی حیدر زیدی (بہ سلسلہ شعر 'تیری گلی میں ہم نہ چلیں') روز نامہ قومی آواز لکھنؤ ۱۳ رنومبر ۱۹۷۱ء۔

۲۹۳۔ مراسلہ میر مصطفیٰ علی قادری: (بہ سلسلہ نعتیہ بند از انیس) روز نامہ 'سیاست' حیدر آباد، ۱۸ رنومبر ۱۹۸۵ء۔

۲۹۴۔ مرثیہ میر انیس: جلد دوم، مطبع نول کشور لکھنؤ، چوتھا ایڈیشن ۱۳۱۵ھ/ ۱۸۹۸ء۔

۲۹۵۔ مرثیہ میر انیس: جلد سوم، مطبع نول کشور لکھنؤ، پانچواں ایڈیشن ۱۳۱۵ھ/ ۱۹۱۶ء۔

۲۹۶۔ مرثیہ ہائے میر انیس مرحوم: جلد پنجم جدید، مطبع شاہی لکھنؤ، دوسرا ایڈیشن ۱۹۰۹ء۔

۲۹۷۔ مرثیہ ہائے میر انیس مرحوم: جلد ششم، مطبع دبدبہ احمدی لکھنؤ محرم ۱۳۱۶ھ/ ۱۸۹۸ء۔

۲۹۸۔ مرثیہ ہائے میر انیس مرحوم: جدید جلد ششم، مطبع شاہی لکھنؤ، دوسرا ایڈیشن ۱۹۱۴ء۔

۲۹۹۔ مرثیہ 'آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے': انیس مکتوبہ میر خورشید علی نفیس، ۲۵ رشوال ۱۲۵۷ھ/ ۹ ردسمبر ۱۸۴۱ء۔ مملوکہ علی احمد دانش

۳۰۰۔ مرثیہ 'جب جنگ کے میدان کو سدھارے علی اکبر': انیس کتابت ۱۲۴۹ھ/ برائے روشن الدولہ وزیر اودھ ذخیرۂ ادیب، مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۳۰۱۔ مرثیہ 'جب گرا گھوڑے سے ہم شکل پیمبر رن میں': انیس کتابت ۱۲ رشعبان ۱۲۶۲ھ۔ کتب خانہ ادیب

۳۰۲۔ مرثیہ 'جس دم یزید شام میں مسند نشیں ہوا': انیس 'تمام شد در نخاس' ۲۲ ر ربیع الثانی ۱۲۶۹ھ کتب خانہ ادیب

۳۰۳۔ مرثیہ 'خورشید حقیقت رخ زیبائے علی ہے': انیس، نوشتہ ۱۲۵۱ھ از بستہ میر سلامت علی شاگرد انیس مملوکہ نجیب حسین، کراچی

۳۰۴۔ مرثیہ 'عرش خدا مقام جناب امیر ہے': انیس، مملوکہ علی محمد واثق لکھنؤ

۳۰۵۔ مرثیہ 'کوفے میں جب حرم حضرت شبیر آئے': انیس، نقل کردہ ۲۹ رجمادی الثانی ۱۲۶۷ھ/ ۱۲ رمئی ۱۸۵۱ء، کتب خانہ ادیب

۳۰۶۔ مرثیہ 'مومنو خانۂ زہرا پہ تباہی ہے آج': انیس، کتابت ۱۲۵۱ھ، از بستہ میر سلامت علی، مملوکہ نجیب حسین کراچی

۳۰۷۔ مرثیہ خوانی کا فن: نیر انیس کے شاگرد میر سلامت علی: (مضمون) نجیب حسین، سہ ماہی 'رثائی ادب' کراچی اپریل ۱۹۹۶ء

۳۰۸۔ مرثیہ خوانی میں میر انیسؔ کے شاگرد میر سلامت علی: (مضمون) نجیب حسین، سہ ماہی 'رثائی ادب' کراچی اپریل ۱۹۹۶ء

۳۰۹۔ مرثیہ ہوسؔ 'آج ہے رہرو صحرائے عدم ابن علیؑ': (مضمون) نیر مسعود، سہ ماہی 'العلم' بمبئی ۱۹۹۴ء

۳۱۰۔ مرزا دبیر سیتاپور میں: (مضمون) نادم سیتاپوری، رسالہ 'ماہ نو' راولپنڈی، دبیر نمبر، ستمبر اکتوبر ۱۹۷۵ء

۳۱۱۔ مرزا رسواؔ کے تنقیدی مراسلات: مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن، ادارہ تصنیف، علی گڑھ ۱۹۶۱ء

۳۱۲۔ مرقع خسروی: شیخ محمد عظمت علی کاکوروی، مرتبہ ڈاکٹر ذکی کاکوروی، مرکز ادب اردو، لکھنؤ ۱۹۸۶ء

۳۱۳۔ مرقع دکن: مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ، خصوصی اشاعت، ماہ نامہ 'سب رس' حیدرآباد جنوری ۱۹۳۹ء

۳۱۴۔ مرقع سخن: مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ، اعظم اسٹیم پریس، حیدرآباد، ۱۹۳۵ء

۳۱۵۔ مرگِ انیسؔ: (مضمون) قاضی عبدالودود، مجلّہ 'معاصر' پٹنہ، شمارہ ا

۳۱۶۔ مرگِ دبیرؔ: (مضمون) قاضی عبدالودود، مجلّہ 'معاصر' پٹنہ، شمارہ ا

۳۱۷۔ مرگِ دبیر کی خبر: اخبار 'نور الانوار' کان پور، ۲۰ر مارچ ۱۸۷۵ء

۳۱۸۔ مزامیر: جلد اول، جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی، کتابی دنیا لمیٹڈ، دہلی ۱۹۴۷ء

۳۱۹۔ مستند تاریخ اودھ: حصہ اول و سید کمال الدین حیدر، مرتبہ رئیس آغا، ناشر مصنف لکھنؤ ۱۹۹۸ء

۳۲۰۔ مسعود حسن ادیبؔ: (مضمون) نیر مسعود، سہ ماہی تحریر، اپریل۔جون ۱۹۷۴ء

۳۲۱۔ مسعود حسن ادیبؔ فرد اور فنکار: مرتبہ سبط محمد نقوی، ناشر مصنف، ۱۹۸۰ء

۳۲۲۔ مشاہیر ادب: (مضمون) محمد عبداللہ قریشی، مجلّہ نقوش، لاہور، مکاتیب نمبر حصہ دوم

۳۲۳۔ مصوران فطرت انیسؔ اور تلسی داس: (مضمون) سید فیاض حسین داس، رسالہ 'وثیقہ دار' لکھنؤ (مرثیہ نمبر) ۱۳۶۹ھ

۳۲۴۔ معارف سخن: میر علی محمد عارفؔ لکھنوی، مرتبہ سید یوسف حسین شائق و ڈاکٹر سید صفدر حسین زیدی، ناشر بارگاہ ادب، لاہور ۱۹۷۷ء

۳۲۵۔ معتمد الدولہ آغا میر: ڈاکٹر انصار اللہ، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی ۱۹۸۸ء

۳۲۶۔ معدن الفوائد: (فارسی، قلمی) رقعات مرزا قتیلؔ، مخطوطہ لکھنؤ یونیورسٹی ٹیگور لائبریری لکھنؤ

۳۲۷۔ معراج نامہ: (اسم دیگر 'ممتاز نامہ' قلمی) مرزا سلامت علی دبیرؔ، مخطوطہ کتب خانہ جامعہ ناظمیہ لکھنؤ

۳۲۸۔ معراج نامہ: مرزا سلامت علی دبیرؔ، مطبع جعفری لکھنؤ

۳۲۹۔ معرکۂ انیس و دبیر: نیر مسعود، ناشر محمدی ایجوکیشن اینڈ پبلی کیشن، کراچی ۲۰۰۰ء

۳۳۰۔ مفتی میر محمد عباس لکھنوی: ابوذر غفاری، ناشر مصنف ۱۹۹۶ء

۳۳۱۔ مقالات حالی: حصہ اول، خواجہ الطاف حسین حالی، انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ ۱۹۵۷ء

۳۳۲۔ مکاتیب انیس، میر مہر علی، ذخیرہ دلہبی پور، نقول ذخیرۂ ادیب

۳۳۳۔ مکاتیب انیس، میر مہر علی، ذخیرہ دلہبی پور، نقول ذخیرۂ ادیب و مشمولہ انیسیات

۳۳۴۔ مکاتیب مونس، میر نواب، ذخیرہ دلہبی پور، نقول ذخیرۂ ادیب

۳۳۵۔ مکاتیب نفیس، میر خورشید علی، ذخیرہ دلہبی پور، نقول ذخیرۂ ادیب

۳۳۶۔ مکتوب آغا حسین ارسطو جاہی، سید، بہ نام ادیب ۹/ جون ۱۹۴۳ء

۳۳۷۔ مکتوب آغا حسین ارسطو جاہی، سید، بہ نام ادیب ۱۹/ جون ۱۹۴۳ء

۳۳۸۔ مکتوب آغا حسین ارسطو جاہی، سید، بہ نام ادیب ۱۹۵۹ء

۳۳۹۔ مکتوب آہ سیتاپوری، ڈاکٹر صفدر بہ نام نیر مسعود ۲۵ فروری ۱۹۷۸ء

۳۴۰۔ مکتوب آہ سیتاپوری، ڈاکٹر صفدر بہ نام نیر مسعود ۱۱/ اپریل ۱۹۷۸ء

۳۴۱۔ مکتوب آہ سیتاپوری، ڈاکٹر صفدر بہ نام نیر مسعود ۲۱/ اپریل ۱۹۷۸ء

۳۴۲۔ مکتوب اکبر علی بہ نام انیس ۵/ محرم ۱۲۸۵ھ/ ۲۹/ اپریل ۱۸۶۸ء مملوکہ علی محمد واثق

۳۴۳۔ مکتوب امیر سجاد (عالی) محمد بہ نام نیر مسعود ۱۳/ مارچ ۲۰۰۰ء

۳۴۴۔ مکتوب انیس بہ نام مونس (مشمولہ انیسیات)

۳۴۵۔ مکتوب انیس بہ نام سردار میرزا مملوکہ علی محمد واثق

۳۴۶۔ مکتوب بہ نام مرزا محمد عباس مملوکہ علی محمد واثق

۳۴۷۔ مکتوب بدر الحسن عابدی، ڈاکٹر، بہ نام ادیب ۱۴/ مارچ ۱۹۷۲ء

۳۴۸۔ مکتوب حالی، خواجہ الطاف حسین بہ نام نواب احمد سعید خاں طالب، نقل فرستادۂ اکبر علی خاں عرشی زادہ

۳۴۹۔ مکتوب حنفی، ڈاکٹر محمد شمیم، بہ نام نیر مسعود ۱۸/ جون ۲۰۰۰ء

۳۵۰۔ مکتوب حیدری، ڈاکٹر اکبر، بہ نام نیر مسعود فروری ۱۹۸۹ء

۳۵۱۔ مکتوب خیال، نصیر حسین بہ نام محمد مسلم 'نقوش' مکاتیب نمبر، شمارہ ۶۵۔۶۶، نومبر ۱۹۵۷ء

۳۵۲۔ مکتوب ذاکر لکھنوی بہ نام سید علی حامد حامد، جون پوری، ۱۷/ دسمبر ۱۹۲۷ء، ذخیرۂ ادیب

۳۵۳۔ مکتوب رشید احمد، سید بہ نام ادیب ۵/ اگست ۱۹۷۲ء ذخیرۂ ادیب

۳۵۴۔ مکتوب نجیب حسین بہ نام نیر مسعود، ۷/ اپریل ۱۹۹۷ء

۳۵۵۔ مکتوب نجیب حسین بہ نام مدیر 'رثائی ادب' کراچی، جولائی۔ ستمبر ۱۹۹۷ء

۳۵۶۔ مکتوب نفیس، میر خورشید علی بہ نام مرزا غلام محمد ۲/ شوال ۱۲۸۰ھ/ ۱۱/ مارچ ۱۸۶۴ء مملوکہ علی محمد واثق

۳۵۷۔ مکتوب نقوی، سید ضمیر اختر بہ نام نیر مسعود ۲۷/ مئی ۱۹۷۹ء

۳۵۸۔ مکتوب نقوی، سید نائب حسین، بہ نام نیر مسعود ۲۴/ مئی ۱۹۷۸ء

۳۵۹۔ مکتوب وارث اسماعیل، نواب سید بہ نام نیر مسعود جنوری ۱۹۸۶ء

۳۶۰۔ ملک اختر: واجد علی شاہ اختر، مطبع سلطانی، کلکتہ ۱۲۹۱ھ

۳۶۱۔ منتخب تنقیح الاخبار: (فارسی) راجا کندن لال اشکی، مطبع حاجی ولی محمد، لکھنؤ ۱۲۶۷ھ

۳۶۲۔ منتخب مراثی انیس: صدی ایڈیشن مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۷۴ء

۳۶۳۔ منظومات میاں دلگیر: مرتبہ ڈاکٹر اکبر حیدری، مکتبہ ادبستان، سری نگر ۱۹۷۰ء

۳۶۴۔ موازنۂ انیس و دبیر: شبلی نعمانی، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ ۱۹۸۲ء

۳۶۵۔ میر انیس اور ان کے اسلاف واخلاف: (مضمون) سید محمد عباس ہفت روزہ 'پیام اسلام' لکھنؤ ۸/ جون ۱۹۵۸ء

۳۶۶۔ میر انیس اور مرزا دبیر کا بنارس میں پہلی مرتبہ ورود: (مضمون) مولوی باقر حسین جون پوری، اخبار 'طریقت' جون پور یکم اکتوبر ۱۹۳۴ء

۳۶۷۔ میر انیس حیات اور شاعری: ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی ۱۹۷۶ء

۳۶۸۔ میر انیس حیدرآباد میں: (مضمون) ڈاکٹر رشید موسوی، ماہنامہ 'نیا دور' لکھنؤ جنوری ۱۹۶۳ء

۳۶۹۔ میر انیس کا سفر دکن، حیدرآباد کی علمی تاریخ کا ایک نادر ورق: (مضمون) سید آغا حسین ارسطو جاہی، ماہنامہ 'ہمایوں' لاہور نومبر ۱۹۴۰ء

۳۷۰۔ میر انیس کا نو دریافت کلام: (مضمون) سید علی احمد دانش، ماہنامہ 'نیا دور' لکھنؤ جون ۱۹۷۹ء

۳۷۱۔ میر انیس کی اصلاحیں: (مضمون، قلمی) سید مسعود حسن رضوی ادیب (مسودۂ مصنف)

۳۷۲۔ میر انیس کی شخصیت اور مزاجی کیفیت: (مضمون) نیر مسعود، ماہنامہ 'نیا دور' لکھنؤ دسمبر ۱۹۷۸ء

۳۷۳۔ میر انیس کے حالات زندگی: (مضمون) ضمیر اختر نقوی، ماہنامہ 'ماہ نو' انیس نمبر، کراچی ۱۹۷۲ء

۳۷۴۔ میر انیسؔ مغفور: (مضمون) نوبت رائے نظرؔ لکھنوی، ماہنامہ 'زمانہ' کان پور، اکتوبر۱۹۰۸ء

۳۷۵۔ میر ببر علی مرحوم ومغفور: (مضمون) سید آغا مہدی، انیسؔ (یادگاری مجلہ دبستان انیسؔ) راولپنڈی ۱۹۷۴ء

۳۷۶۔ میر خلیق کا ایک سلام: (مضمون) سید محمد عباس، ماہنامہ 'حقائق' لکھنؤ محرم ۱۳۵۴ھ/اپریل ۱۹۳۵ء

۳۷۷۔ میر خورشید علی نفیسؔ، حیات اور شاعری: سبطین فاطمہ رضوی، ناشر مصنف ۱۹۹۵ء

۳۷۸۔ میر علی محمد عارف: (مضمون) مرزا جعفر حسین، ماہنامہ 'نیا دور' لکھنؤ، جنوری ۱۹۷۸ء

۳۷۹۔ میر مونسؔ: (قلمی) محسن رضا (تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی لکھنؤ یونیورسٹی)

۳۸۰۔ میرزا یگانہ، غیر مطبوعہ اشعار: مرتبہ مشفق خواجہ، مشمولہ تخلیقی ادب، کراچی، ۱۹۸۰ء

۳۸۱۔ مینول نائٹل آف اودھ: مترجمین بنواری لال سکسینہ ورام گوپال، اودھ پریس لکھنؤ ۱۸۹۹ء

۳۸۲۔ ناسخؔ: سید شبیہ الحسن، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی ۱۹۸۴ء

۳۸۳۔ ناسخؔ، تجزیہ وتنقید: سید شبیہ الحسن نونہروی، اردو پبلشرز لکھنؤ ۱۹۷۵ء

۳۸۴۔ نشتر: ترجمہ 'فسانہ رنگین' مصنفہ سید حسن شاہ، مترجم سجاد حسین کسمنڈوی، کتابی دنیا لکھنؤ

۳۸۵۔ نصرت فتح علی خاں: (مضمون) سہیل احمد فاروقی، رسالہ 'جامعہ' نئی دہلی، جولائی۔ستمبر ۱۹۹۷ء

۳۸۶۔ نظم رہنما: نواب میر محمد حسین خاں امیر: بہ اہتمام حاجی حسن علی، لکھنؤ ۱۲۸۸ھ

۳۸۷۔ نغمہ العجم: رقعات حاجی سید ولایت علی غازی پوری، مرتبہ مولوی سید مظہر حسن، مطبع محمدی آگرہ، ۱۲۸۶ھ

۳۸۸۔ نکاح نامہ میر نواب مونسؔ: ذخیرۂ ادیب

۳۸۹۔ نکاح نامہ ہرمزی بیگم بنت میر مستحسن خلیقؔ: ذخیرہ ادیب

۳۹۰۔ نگارشات ادیبؔ: سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ، کتاب نگر لکھنؤ ۱۹۶۹ء

۳۹۱۔ نواب بہو بیگم (مضمون) سید سبط محمد نقوی، دو ماہی 'اکادمی' لکھنؤ جولائی ۱۹۸۲ء

۳۹۲۔ نواب جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی اور ان کی نثری خدمات (قلمی): دلجیت ورما: (تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی، جموں وکشمیر یونیورسٹی) ۱۹۹۶ء

۳۹۳۔ نواب واجد علی شاہ اور مرثیہ نگاری (مضمون): ڈاکٹر کوکب قدر سجاد علی میرزا، علی گڑھ میگزین، علی گڑھ

۳۹۴۔ نوادرِ مرزا دبیرؔ: (مضمون) نیر مسعود، سہ ماہی 'اردو' کراچی، جولائی۔ستمبر ۱۹۹۰ء

۳۹۵۔ نونگہ موسوم بہ محاربہ غدر: منشی میڈی لال، مطبع گلشنِ اودھ، لکھنؤ ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء

۳۹۶۔ واجد علی شاہ اور ان کا عہد: رئیس احمد جعفری، کتاب منزل، لاہور، ۱۹۵۷ء

۳۹۷۔ واجد علی شاہ اوران کی ادبی اور ثقافتی خدمات: ڈاکٹر کوکب قدر سجاد علی میرزا، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۹۵ء

۳۹۸۔ واجد علی شاہ اور انیسؔ: (مضمون) ڈاکٹر کوکب قدر سجاد علی میرزا دو ماہی ’العلم‘ بمبئی، اگست ۱۹۹۲ء

۳۹۹۔ واقعات انیس: سید مہدی حسن احسنؔ لکھنوی، اصح المطابع لکھنو ۱۹۰۸ء

۴۰۰۔ وزیرنامہ (فارسی)

۴۰۱۔ وضع داران لکھنؤ: حصہ اول، سید محمد ہادی لکھنوی، تصویر عالم پریس لکھنؤ ۱۹۰۸ء

۴۰۲۔ وظائف الصالحین: سید آصف حسن رضوی، محفوظ بک ایجنسی، کراچی ۱۹۹۸ء

۴۰۳۔ وقار انیسؔ: جلد دوم، مرتبہ سید محمد میرزا مہذب لکھنوی، انجمن حافظ اردو، لکھنؤ ۱۹۵۴ء

۴۰۴۔ ہدایت المومنین: مولوی اولاد حسن قنوجی، متن مشمولہ ’سیف المومنین‘ (دیکھیے سیف المومنین)

۴۰۵۔ ہسٹری آف انڈین ریلویز: ریلوے روڈ، حکومت ہند، نئی دہلی ۱۹۶۰ء

۴۰۶۔ ہجولی: حصہ اول، خواجہ محمد عبدالرؤف عشرتؔ لکھنوی، گیلانی پریس لاہور

۴۰۷۔ ہندی شاعری میں مسلمانوں کا حصہ: ڈاکٹر سہیل بخاری، مکتبہ اسلوب، کراچی ۱۹۸۵ء

۴۰۸۔ یادداشتیں: ادیبؔ (متفرق کاغذات)

۴۰۹۔ یادگار انیسؔ: امیر احمد علوی، انوار المطالع لکھنؤ ۱۹۲۵ء (؟)

۴۱۰۔ یادگار حامد: سید علی نقی صفیؔ لکھنوی، نظامی پریس لکھنؤ

۴۱۱۔ یادوں کی برات: جوشؔ ملیح آبادی، شالیمار بکس، دہلی ۱۹۸۲ء

☆☆..........☆☆

مقتدرہ قومی زبان نے ادارے کے دوسرے اہم وظائف کے ساتھ ساتھ یہ ضرورت بھی محسوس کی کہ اُردو کے بنیاد گزاروں کو یاد رکھا جانا چاہیے تاکہ آئندہ نسلوں کو اُن کی علمی، ادبی اور لسانی خدمات سے آگاہ کیا جاسکے۔ مشاہیر اُردو کے عنوان سے پیش نظر سلسلۂ مطبوعات کا آغاز کیا گیا ہے جس میں اُردو کے محسنوں اور بنیاد گزاروں کی اُردو کے لیے خدمات پر تعارفی نوعیت کی مختصر مگر جامع کتابیں شائع کی جائیں گی۔ اس منصوبے کے تحت مختلف شخصیات پر تحقیقی اور تنقیدی اعتبار سے وقیع کتابیں مرحلہ وار اشاعت پذیر ہوں گی۔

وہ زبان جس کے دامن میں میر ببر علی انیس جیسا شاعر موجود ہے وہ یقیناً ایک بڑی اور توانا زبان ہونے کا دعویٰ بلاخوف وتردید کر سکتی ہے۔ مقتدرہ قومی زبان نے سلسلہ مطبوعات مشاہیر اُردو کے لیے میر ببر علی انیس کا انتخاب کیا تاکہ ان کی اُردو کے لیے خدمات کو خراج تحسین پیش کیا جاسکے اور نئی نسل بھی ان کی عظمت سے آگاہ ہو سکے۔ ڈاکٹر نیر مسعود اُردو کے نامور محقق، ممتاز افسانہ نگار، صاحب نظر تنقید نگار ہیں۔ انھوں نے ہماری درخواست پر میر ببر علی انیس کی شخصیت اور فن کے حوالے سے یہ کتاب لکھ کر اردو کی یقیناً بڑی خدمت سرانجام دی ہے۔